ڈپٹی نذیر احمد کے شعری مجموعے نظم بے نظیر کا تنقیدی جائزہ

(نوآبادیاتی عہد کے وکٹوریائی تصورِ اخلاق کے تناظر میں)

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار

محمد احمد صدیقی

رجسٹریشن نمبر:255-FLL/MSURDU/F20

نگران

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

کلیۂ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

۲۰۲۳ء

Accession No TH-27375

MS
891.4391
ص د ڈ

اُردو ادب، شعری مجموعے

تنقیدی جائزہ

ڈپٹی نذیر احمد کے شعری مجموعے نظم بے نظیر کا تنقیدی جائزہ

(نوآبادیاتی عہد کے وکٹوریائی تصورِ اخلاق کے تناظر میں)

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

محمد احمد صدیقی

رجسٹریشن نمبر:255-FLL/MSURDU/F20

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان وادب

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

اقرار نامہ

میں محمد احمد صدیقی، رجسٹریشن نمبر:255-FLL/MSURDU/F20حلفیہ اقرار کرتاہوں کہ مقالہ بعنوان **"ڈپٹی نذیر احمد کے شعری مجموعے نظم بے نظیر کا تنقیدی جائزہ(نوآبادیاتی عہد کے وکٹوریائی تصورِ اخلاق کے تناظر میں"** میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اِسلامی، یونی ورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

محمد احمد صدیقی

مقالہ نگار

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **''ڈپٹی نذیر احمد کے سفری مجموعۂ نظم بے نظیر کا تنقیدی جائزہ (نوآبادیاتی عہد کے وکٹوریائی تصورِ اخلاق کے تناظر میں)''**

مقالہ نگار: محمد احمد صدیقی

رجسٹریشن نمبر: 255-FLL/MSURDU/F120

کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر سید عون ساجد نقوی
ایسوسی ایٹ پروفیسر
وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
چیئر پرسن، شعبہ اردو

اگست، 2023ء

تصدیق نامہ

محمد احمد صدیقی نے رجسٹریشن نمبر:255-FLL/MSURDU/F20 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو بعنوان **"ڈپٹی نذیر احمد کے شعری مجموعے نظم بے نظیر کا تنقیدی جائزہ (نوآبادیاتی عہد کے وکٹوریائی تصورِ اخلاق کے تناظر میں"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحن کو بھجوادیا جائے۔

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

فہرستِ ابواب

پیش لفظ

باب اوّل: عہد نو آبادیات اور وکٹورین تصور اخلاق: بنیادی مباحث

باب دوم: شعری مجموعے نظم بے نظیر میں سیاسی و سماجی عوامل

باب سوم: شعری مجموعے نظم بے نظیر میں تہذیبی واخلاقی اقدار

باب چہارم: شعری مجموعے نظم بے نظیر میں ڈپٹی نذیر احمد کا تصور اخلاق: تنقیدی تجزیہ

کتابیات:

انتساب

رقم کریں گے ترا نام اِنتسابوں میں
کہ انتخاب سخن ہے یہ انتخابوں میں

اظہار تشکر

لامحدود و لاتعداد تعریفیں اس خالق شش‌جہت کے لیے جو رحیم و کریم کی صفت سے موصوف ہے۔ جس نے ہمیں ایک انفرادیت بخشی اور قلم کے ذریعے علم سکھایا۔

بے حد و حساب درود اس بے مثال ذات پر جو عالمین کے لیے رحمت ہے۔ جنہوں نے ذکر کی بجائے علم کی محفل کو ترجیح دی۔ بندہ ناچیز کے پاس تکمیل مقالہ پر خراج تحسین اور ہدیہ تشکر پیش کرنے کے لیے مناسب و موضوع الفاظ نہیں مگر: حدیث رحمت رب العالمین رسول کریم ﷺ ہے جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا، کی رو سے سنت نبوی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میں بے پناہ متشکر و ممنون اپنے پیارے مقالے کے نگران جناب ڈاکٹر کامران عباس کاظمی صاحب کا جنہوں نے میری قدم قدم پر رہنمائی کی اور مشکلات کی فصیلیں در فصیلیں میرے سامنے سب کھول کے رکھ دیں۔ جس سے میرے لیے ادب کی راہیں ہموار ہوئیں۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب کا تہہ قلبی سے مشکور ہوں جو کہ ہم سب طالب علموں کے ذہنی ظلمات کو دور کرنے کے لیے ہمیشہ بطور جگنو کے ثابت ہوتے ہیں۔ میں شعبہ اردو کے تمام عظیم اساتذہ کا شکر گزار ہوں۔ خصوصاً ڈاکٹر مظہر علی طلعت صاحب کا جن کی بے پناہ شفقت اور مفید آراء نے میری ہر مشکلات کو آسانیوں میں بدلا۔ میں محمد اسحاق خان کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولوں گا جنہوں نے گاہے گاہے مقالے کی تکمیل میں ہر ممکن تعاون کیا۔ میں ڈاکٹر سجاد نعیم صاحب کا بے حد مشکور ہوں جن کے سبب میری علمی، ادبی، افقی بلندیاں عروج کو پہنچی۔

میں اپنے تمام اہل خانہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو کہ میری زندگی کا اثاثہ ہیں۔ میں مقروض ہوں بے پناہ محبتوں کا اپنی پیاری جنت اپنی امی کلثوم صدیقی کا جن کی گود میرے لیے اول درسگاہ بنی بسبب جن کے میرا ظاہری وجود دارِ فانی کی زینت بنا۔ جنہوں نے اپنی بے پناہ محبت سے کبھی شفقت پدری کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ اردو ادب سے خود وابستگی کی صورت میں مقالے کی مشکلات میں مشعل راہ بنی رہیں۔

میں تہہ قلبی سے اپنی آنٹی رابعہ صدیقی کا مشکور ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور میٹھی ٹکوروں نے میرے پست ارادوں کو عروج بخشا۔ میں اپنی چھوٹی پیاری بہن شیما صدیقی کا مشکور ہوں، جس کا مسکراتا چہرہ مجھے کامیابی کی نوید بخشتا ہے۔

میں اپنی پیاری بہن ماریہ صدیقی کا شکریہ اس لیے ادا نہیں کروں گا کیونکہ میرے نزدیک بہن کے بے مثال رشتے میں شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا پڑتا ہے۔ میں اپنی نانی اماں کا شکر گزار ہوں کہ ان کی دعائیں میرے آگے بڑھنے کا سبب ہیں۔ اپنے نانا ابو ہیڈ ماسٹر ظہور احمد صدیقی کا شکریہ میں ادا کر ہی نہیں سکتا کیونکہ میرے پاس اتنے الفاظ نہیں کہ میں ان کی شخصیت بیان کر سکوں اور یہ بیان کر سکوں کہ میرے لیے وہ کس قدر محترم شخصیت ہیں۔ میرے علم حاصل کرنے کی ابتداء ان کی مرہون منت ہے۔ ان کا شفقت کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رہا اور زندگی کا جواز ملا۔ ثناء افتخار کا دل سے مشکور ہوں جو میرے مقالے کی تیاری میں بہتر مشورے دیتی رہی اور ان کی مفید باتیں میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ میں متشکر ہوں جویریہ ظفر کا جو میری ذہنی رنجشوں کے حوالے سے میرے لیے مستفید ثابت ہوئیں۔

آخر میں اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولوں گا۔ میں شکر گزار ہوں اپنے پیارے دوست تیمور لطیف کا جو میرے عروج کے لیے ہر ساو ہمہ تن میرے ساتھ پُر جوش رہے۔ میں دلی طور پر متشکر ہوں حسن رضا کا جس نے مقالے کی تکمیل میں ہر ممکن تعاون کیا جن کا احسان مجھ پر تاحیات رہے گا۔

اس کے علاوہ میں مشکور ہوں کاظم حسین، عدنان عزیز بھروانہ، ارسلان رضا قریشی، معروف رضا، رانا وقار مزمل کا جن کی دوستی پر میں افتخار محسوس کرتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں میرا یہ مقالہ تمام ذوشناس ادب تمام احباب سخن و شعور کے لیے بطور سرمایہ کے ثابت ہوگا۔

محمد احمد صدیقی

مقالہ نگار

باب اول:

عہد نوآبادیات اور وکٹورین تصور اخلاق: بنیادی مباحث

ا۔ نوآبادیات

برصغیر جیسازرخیز خطہ شروع سے ہی دنیا کی آنکھوں کا مرکز رہا ہے۔عالمی استعماری قوتوں نے برصغیر کو اپنے معاشی اغراض کے لیے استعمال کیا ہے۔ہر غاصب نے برصغیر کے لوگوں کی فلاح اور اصلاح کے نام پر ایسی اصطلاحات کو نافذ کیا، جس کے طفیل برصغیر کے لوگ تمام وسائل سے لیس ہونے کے باوجود دوسری اقوام کے غلام بنے رہے۔ جس کی وجہ سے یہاں اخلاقی اقدار کا نظام بھی مضبوط نہ رہا۔

مغلیہ سلطنت جب آخری مراحل میں پہنچی تو درباری شان وشوکت مدھم ہونا شروع ہوئی اور دوسری طرف استعماری قوتیں مضبوط ہونے لگیں تجارت کے مقاصد سے برصغیر میں وارد ہونے والے انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کیا تو وہ اپنی روایات کے ساتھ ساتھ برصغیر کے اخلاقی اقدار سے بھی بیزار ہوتے چلے گے۔

انگریز برصغیر پر سالہ سال حکومت کرنے کا جال بُن رہے تھے، یہی رسوا کردہ استعماری نکات ہندوستان کے اثاثہ جات کو برطانیہ میں لے جانے میں معاون ثابت ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ برصغیر کے باشندوں کو ذہنی غلامی، مایوسی اور ناامیدی کے گڑھوں میں دھکیلا جارہا تھا۔ذہنی غلامی کا یہی دور برصغیر کا وہ دور ہے جسے نوآبادیاتی دور کہتے ہیں۔

انگریزی ’’Colonialism‘‘ کا اردو ترجمہ ’’نوآبادیات‘‘ ہے۔جس کا مطلب نئی آبادی ہے۔نوآبادیات میں کسی قوم کا دوسری قوم کے اندر سیاسی، سماجی اور معاشی اجارہ داری ہے۔

The Oxford English Dictionary میں بطور اصطلاح کالونیل ازم اس طرح درج ہے کہ:

"The Alleged Policy of Exploitation of weak peoples

by a " foreign power"(۱)

یعنی کہ کمزور اور پسماندہ عوام کے استحصال کے لیے غیر ملکیوں کی جانب سے تشکیل دی جانے والی ممکنہ حکمت عملی، اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری میں "نوآبادیات" کا یہ مفہوم ملتا ہے کہ:

"نوآبادیات سے مراد مختلف آباد کاروں کا کسی نئی زمین کو اس طرح آباد کرنا کہ آباد کاری کے اس عمل میں ان کا اپنی جدی ریاست (Parent State) سے تعلق برقرار رہے اور آباد کاری کے مراحل جدی ریاست کے زیر نگرانی پروان چڑھیں۔"(۲)

Ania Loomba کے نوآبادیات کے بارے میں اصل الفاظ یہ ہیں:

"Colonialism can be defined as the conquest control of other peoples land and goods"(3)

نوآبادیات سے مراد دوسرے لوگوں کی زمین کو فتح کر کے ان کی املاک پر قبضہ کر لینا ہے۔

فرانتز فینن کے مطابق:

"وہ نوآبادیاتی نظام سوچنے والی مشین نہیں ہوتا، نہ ہی وہ ایسا جسم ہوتا ہے جس میں دلائل کو صلاحیتیں بھی حاصل ہوں۔ یہ نہایت وحشیانہ قسم کا تشدد ہوتا ہے اور محض اس وقت گھٹنے ٹیکتا ہے، جب اس کا مقابلہ زیادہ بڑے تشدد سے ہو۔"(۴)

اشفاق سلیم مرزا کے بقول:

"عمومی طور پر نوآبادی کے لوگوں کو خود مختاری اور سیاسی آزادی حاصل نہ ہو اور اس کے مطیع ہوں اور دونوں کا رشتہ استحصالی بنیادوں پر قائم ہو۔ نوآبادی پر قبضے کا بنیادی

مقصد صرف یہ ہو کہ سامراجی طاقت کی دولت اور خوشحالی میں اضافہ ہو اور باہر منڈی میں خام مال اور انسانی محنت کے جو دام دینے پڑ رہے ہیں اس سے کم داموں پر سہولت میسر آسکے اور اپنی تیار اشیاء کی کھپت مقبوضہ علاقوں میں آسانی اور منہ مانگے داموں کے عوض ہو سکے۔"(۵)

برصغیر میں معاشی تقاضوں کے تحت سیاسی معاشرتی، ثقافتی اور فکری تبدیلیاں ہوئیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں برصغیر کی آبادی تین درجات میں منقسم ہو چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا جس وقت دست کاری پر مشتمل صنعت دم توڑ چکی تھی اور بڑے بڑے پیمانے کی ساری تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کی داخلیت میں آگئی تھی۔ برصغیر کے جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور نوابین کے حکمران طبقے کا بھی انگریزوں کے ہاتھوں استحصال ہو گیا تھا۔

دست کاری کی صنعت کی ختم ہونے کے بعد برصغیر کی پیداوار صرف زرعی رہ گئی تھی اور ایک ہی کسانوں کا طبقہ رہ گیا تھا۔ دوسرا طبقہ پرانے اور نئے زمینداروں کا تھا جو کسان کی محنت پر عیش کرنا، شراب پیتا تھا۔

غریب کسان کی خون پسینے کی یہ روزی منشیوں، غنڈوں اور تھانے داروں کے ذریعے لوٹ لی جاتی تھی۔ تیسرا طبقہ سب سے امیر طبقہ تھا یہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے افسروں کا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیوانی حقوق پالینے کے بعد کسانوں کے براہ راست استحصال کے نئے مزید طریقے سوچنے شروع کر دیے اور اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پہلے درجہ کی یہ کوشش تھی کہ کس طرح سامراجی لوٹ کا نکتہ مستقل ہو جائے اور دوسرے درجے پر غریب کسان سے جو لیا جاتا ہے اس کا زیادہ حصہ کمپنی کو ملے۔ درمیان کے لوگ کم سے کم منافع حاصل کر پائیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظر میں اس طرح سے کسانوں کی مدد اولین تھی، وگرنہ کسان نہ ہوں گے تو پیداوار کہاں سے حاصل ہو گی اور مالیہ کہاں سے کیسے حاصل ہو گا۔اس لیے زرعی پیداوار کا سلسلہ برقرار رکھا جانے لگا، کیونکہ کوٹھیوں، بنگلوں اور حویلیوں میں شاہانہ زندگی غریب کسان کی دن ورات کی کمائی سے بسر ہوتی ہے۔کسانوں کو پیداوار میں سے تھوڑا حصہ دینا لازمی قرار دیا تاکہ کسان کی زندگی کی کم سے کم ضرورتیں پوری ہو سکیں اور باقی حصہ استحصال کرنے والوں اور مالیہ وصول کرنے والوں اور ایجنٹوں زمیندار میں تقسیم ہو جائے۔

مغلوں کے تو زمانے میں زمین کی ملکیت انفرادی نہیں تھی۔اسلامی قانون کی وضاحت و تشریح اس طرح سے تھی کہ ساری زمین اللہ کی ملکیت ہے، بادشاہ اللہ کا خلیفہ ہے۔سب کاشت کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے اخراجات برداشت کرنے کے لیئے انتظامی مشینری کو اپنی پیدوار کا حصہ دیں۔

کسان خوب محنت کرتے تھے اور بادشاہوں کی عیش کی زندگی کے اخراجات مالیہ کی صورت میں ادا کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔انگریزوں نے برصغیر میں ایک نئی قسم کی ملکیت کے نظام کے تحت ایک نئی قسم کے زمیندار طبقے کو جنم دیا۔

اٹھارویں صدی اور انیسوی صدی کے شروع میں برصغیر میں اقتدار میں تبدیلی رونما ہوئی، باقی ہر طرح سے زوال رہا۔ڈکیتی، ٹھگی اور کسان پر مظالم کی کوئی حد نہ رہی۔

انگریز حکمران نے اصلاح کے لئے سخت قانون متعارف کروائے لیکن عمل درآمد نہ کیا جاسکا۔

نئے نوآبادیاتی نظام کی بنیادیں مقامی جاگیرداروں، زمینداروں کے گٹھ جوڑ سے کسانوں کے آنسوؤں، پسینے سے استوار ہوئیں۔

نو آبادیاتی نظام کو فروغ دینے کے لیے یورپی اقوام کے بہت سے مقاصد پنہاں تھے۔ مقاصد میں سے سب سے پہلے نمبر پر کالونیوں میں قدرتی وسائل کی لوٹ کے ساتھ یورپ کی مصنوعات کی کھپت کے لیے نئی منڈیوں کی جگہ کی تلاش تھی۔ دوسرے نمبر پر عیسائیت کے مذہب کی اشاعت تھی۔ برصغیر کے لوگوں پر غاصبانہ قبضہ کرنا اور ان کے سرمایوں کو اپنی معیشت کی ترقی کے لئے استعمال کرنا تھا۔

انگریزوں کی نو آبادیات کا اثر انداز برصغیر کی سیاست اور معاشیات دونوں پر ہوا۔ معاشی لوٹ مار کی وجہ سے برصغیر کے لوگ انتہائی غربت کا شکار ہو چکے تھے۔ اس حالات نے برطانوی سامراج اور برصغیر کے باشندوں کے مابین مستقل کش مکش اور تضاد کی بنیاد ڈالی۔

انگریزوں کی استعماری غلامی نے ذہنی حالت کو داغ دار اور زندگی کو فنا کر دیا تھا۔ برصغیر کا پورا معاشرہ انگریزوں کی سامراجی اقتدار، معاشی لوٹ کھسوٹ اور تمدنی ناہمواریوں کا بری طرح شکار ہوا۔ انگریزوں کا مقصد کالونیوں کے ساتھ تجارت کے ذریعے زیادہ منافع کا حصول تھا، انھوں نے تجارت سے منافع کی غرض سے برصغیر میں بے شمار دولت حاصل کی اس دولت نے برطانیہ کی معشیت کی تقدیر چمکادی۔

صنعتی انقلاب سے مشین کی تیار شدہ اشیاء برصغیر کی منڈیوں، برطانیہ کے لئے منفرد اور دلچسپی کی حامل ہوا کرتیں تھیں۔ یورپ کو ایسے علاقوں کی تلاش میسر تھی جن سے خام اجناس اور کارخانوں، فیکٹریوں کے لیئے مزدورں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں دستیاب ہو سکیں۔

انگریزوں کے یہ مقاصد برصغیر کے چھوٹی دستکاریوں کو تباہ کرنے اور وہاں کی زراعت کو تجارتی پیراہن میں ڈھال لینے سے حاصل ہوئے، جس سے گھریلو صنعتوں کو بھی کچلا گیا۔ اس طرح برصغیر کے باشندوں کا قدیم خود مختار معاشی نظام درہم برہم ہوا۔

ڈاکٹر زین العابدین کے بقول:

"برطانوی ملوکیت نے نو آبادیوں کو نفع کشی کے تین طریقوں سے لوٹا: اول، تجارتی اجارہ داری سے نوآبادیوں کی دولت سمیٹی، مال سستے داموں خریدااور مہنگے داموں بیچا۔ دوم: مفتوحہ ممالک کی صنعتوں کو بڑے بڑے محصولوں اور دیگر مالی پابندیوں سے کچل دیا۔ سوم: نو آبادیوں کے معاشی وسائل پر قبضہ کر لیا جس سے ان کے معاشی وسائل برطانوی سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر ہو گئے۔"(۶)

انگریزوں کی سرمایہ دارانہ منصوبے کے مقاصد کے زیر اثر برصغیر کے لوگوں کو ہمیشہ برطانوی سامراج کے سامنے جھکاناتھا، جس کی وجہ سے برصغیر ترقی کے لحاظ سے ناکارہ اور پس ماندہ نظر آیا۔

برصغیر کے لوگ غربت اور سماج کے اعتبار سے برطانیہ کی محتاج ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔ انگریزوں کی اس استحصالی قوت نے برصغیر کے باشندوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنادیا۔

برطانوی حکومت میں برصغیر کے لوگوں نے بھوک، بے روزگاری اور بیماری کی مصیبتیں سہی۔ بھوک کی وجہ سے قحط سے لاکھوں برصغیر کے باشندے لقمہ اجل بنے۔

خواجہ عبدالمجید کے مطابق:

"جب اپنے ملک میں پیٹ نہیں پلتا تو دوسرے ملکوں کو آباد کرتے ہیں۔ زمین کا کوئی ایسا خطہ تلاش کرتے ہیں کہ جہاں بزور شمشیر داخل ہو سکیں اور وہ کم آباد بھی ہو اور زرخیز بھی۔ یا تو وہاں کی قوموں کو نیست و نابود کر دیا یا ان کو غلام بنالیا۔"(۷)

انگریزوں کا سامراجی نظام دو دینا کا عکس منظر عام پر لاتا ہے۔ ایک نو آباد کار کی دنیا، دوسری استحصال شدہ لوگوں کی دنیا۔ نو آباد کار کی دنیا میں فوج کی طاقت ظلم اور تشدد کے ذریعے استحصال شدہ لوگوں کو اپنا ذہنی غلام مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی مار، تشدد کے استعمال سے آقا کی دنیا اور غلاموں کی دنیا کا تصور منظر عام پر آیا۔

غلاموں کی دنیا میں مقامی لوگ ذہنی غلامی اور کرب سے کمتر گردانتے جاتے ہیں۔ انہیں انسانی بنیادی حقوق سے لاتعلق کا احساس دلایا جاتا ہے۔

غربت جہالت کے اندھیرے مذہب، تہذیب و ثقافت سے شرمسار ہو کر غلامی کا طوق پہن لیتے ہیں۔ اس غلامی کا اثر یہ ابھرتا ہے کہ غلاموں کو اپنے آقاؤں کی زبان استعمال کرنا ہوتی ہے جس سے وہ اپنی زبان ہیچ سمجھنے لگے۔

انگریز نے ایسا نظام برصغیر پر نافذ کیا۔ جس کا بنیادی مقصد غلاموں کو جنم دینا تھا۔ برطانیہ کے انگریزوں نے برصغیر میں رہنے والے باشندوں کی زبان کو ختم کرنے میں ہر شعوری سعی کی جس سے برصغیر کا قیمتی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی سرمایہ برباد ہو گیا۔

لارڈ میکالے نے برصغیر کے تعلیمی نظام کو شدید ترین نقصان دیا جس کی تلافی کبھی بھی ناممکن نہیں۔ برصغیر کے لوگ جہالت کی تاریکیوں میں سفر کرنے لگے جس سے ان کی زندگیوں کے پراہن مسمار ہو گئے اور وہ اپنے زمانے میں موجود ادب کو کمتر تصور کرنے لگے۔

انگریزی زبان اور انگریزی ادب کی اشاعت زور و شور سے منظر عام پر آنے لگی۔ میکالے برصغیر کی زبان، تہذیب و ثقافت مسمار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"فی الوقت ہماری بہترین کوشش ایک ایسا طبقہ معرض وجود میں لانے کے لئے وقف ہونی چاہئیں جو ہم میں اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں

ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیے۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز ہو۔"(۸)

انگریزوں نے بر صغیر کے باشندوں کو نو آباد کاری نظام کے ذریعے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ انگریز اپنی سامراجیت کو مستحکم کرنے کی وجہ سے ایسے اقدامات اٹھاتے رہے جس سے بر صغیر کے باشندوں کی شناخت ختم ہو جائے، جس سے یہ لوگ ذہنی کرب اور اذیت کا شکار تھے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اس غلامی کے طوق کو اتار دینا چاہتے تھے۔

انگریز بر صغیر کے باشندوں کے لیئے اصول و قوانین اپنی مرضی اور مقاصد کے مطابق ترتیب دیتے تھے۔ وہ ہر بات میں بر صغیر کے لوگوں کو بار بار یہ بات یاد کراتے کہ آپ کے علوم و فنون اور افکار بہت پرانے، لیس ماندہ اور روایتی ہیں جن سے کوئی ترقی کی راہ سہل نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے انگریز اپنے نظریات و افکار بر صغیر کے لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش میں جاری و ساری رہتے تھے، تاکہ وہ ہمیشہ احساس محرومی اور غلامی میں مبتلا رہ سکیں۔

انگریز اپنے عزائم مقاصد، منصوبوں پر اس طرح عمل پیرا ہوتا ہے کہ بر صغیر کے لوگ علمی، سیاسی، ثقافتی طور پر مایوسی کی گہرائیوں میں چلے جائیں۔ بر صغیر کے باشندے محض ایک جسمانی لاش تھے جبکہ یورپی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بر صغیر کے لوگوں کی صرف اتنی صلاحیت تھی کہ وہ سخت، محنت مزدوری کریں جبکہ انگریز فکری و تخلیقی کارنامے سرانجام دیں۔

انگریز یہ جواز پیش کرتے تھے کہ نو آبادیاتی نظام لانے کا مدعا جاہل، گنوار پس ماندہ غیر مہذب اور وحشی قوموں کی تہذیبوں کو ختم کرے اور ان کی جگہ انگریزی اعلیٰ تہذیب و ثقافت کو رواج دینا ہے۔

انگریزوں نے برصغیر کے لوگوں کی ذہنی اور نفسیاتی صحت کو بری طرح متاثر کیا اس کی وجوہات میں سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی نظام کی بنیاد دوستی کی بجائے تشدد اور سامراجی نظام پر رکھی گئی، اس سے غلامی اور حاکمیت کی ایسی فضا قائم ہوئی جس میں تمام انسانوں کا ذہنی قتل عام کیا جاتا تھا۔

برصغیر کے لوگوں کو جانوروں سے بھی بدترین سمجھ کر ان کی روایات کو مدھم کیا گیا، جس نے برصغیر کے باشندوں کا مذہب، تہذیب اور شناخت ختم کر دی۔ برصغیر کے لوگوں نے اس کی کشیدگی سے ذہنی کرب محسوس کیا اور وہ تضادات کا شکار ہوتے چلے گئے۔

برصغیر کے لوگوں کی شعور کی عکاسی ان کی محسوسات، حرکات و سکنات سے محسوس ہوتی تھی جس سے ان میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور حقارت، مزاحمتی رویہ سے بکثرت نظر آتی تھی۔ انگریز باغیوں سے انتقامی بدلے لیتے تھے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اس لیے برصغیر کے باشندے اپنی شکست و ریخت کی وجہ قسمت کو سمجھتے تھے۔

افتادگان میں ہے کہ :

> ''سب نوآبادکار ایک ہی جیسے ہیں۔ جب مقامی باشندے کو اذیت دی جاتی ہے، جب اس کی بیوی کو قتل یا اس کی عصمت دری کی جاتی ہے تو وہ اس بات کی شکایت نہیں کرتا۔ جابر حکومت اگر چاہیے جو ہر روز تحقیقاتی اور معلوماتی کمیشن مقرر کرتی ہے۔ مگر مقامی باشندے کی نظر میں ایسے کمیشنوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔''(۹)

انگریزوں نے برصغیر کے لوگوں کے مذہب اور تہذیب و ثقافت پر گہرے اثرات نقش کیئے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے مذہب اور تہذیب و ثقافت کو اعلیٰ مانا ہے انھوں نے سامراجیت کی بندوق پر اپنے مذہب اور رسم و رواج کو

برصغیر کے لوگوں پر طاری کرنے کی سعی کی ہے۔ جس سے ذہنی غلام منظر عام پر آئے اور برصغیر کے تہذیبی ورثے کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہوئیں۔

برصغیر کے لوگ اپنی تہذیب، کلچر اور اخلاقی اقدار وروایات سے دور چلے گئے جس کے بعد وہ نسل پروان چڑھی جو اپنے فطری اور سماجی ماحول سے بیگانہ تھی۔

انگریزوں نے صرف سیاسی جاگیرداری کو طاقت نہیں دی بلکہ برصغیر کے لوگوں سے تہذیبی و ثقافتی غلامی کا بھی تقاضا رکھا۔

ثقافتی غلامی سے برصغیر کے لوگوں کی شناخت کی پامالی ہوئی جس کی وجہ سے نیا کلچر منظر عام پر آیا۔ انگریزوں کی حکمرانی کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب و ثقافت نے برصغیر کے لوگوں کی زندگی کا استحصال کیا۔ اس کی اہم وجہ انگریزوں کا اپنی تہذیبی برتری کا تصور تھا۔

رفتہ رفتہ برصغیر کے باشندے اپنی تہذیب و ثقافت کو پرانا روایتی گردانتے گئے۔ ان کے ذہن میں مغربی تہذیب و ثقافت نقش ہونا شروع ہوئی۔ برصغیر کے لوگ انگریزوں کے لباس، رہنے سہنے کے انداز، زبان، اور مذہبی رسم وروایات کو اعلیٰ وارفع سمجھنے لگے۔

سید عابد حسین کہتے ہیں کہ:

> ''سیاست اور معیشت کے میدان میں انگریزی تہذیب نے ہندوستان کو عہد جدید کے رحجانوں سے تو آشنا کر دیا لیکن ان کی نشوونما کا موقع نہ دے کر ملک میں سخت ابتری اور انتشار کی کیفیت پیدا کر دی۔ اس طرح ذہنی زندگی کے میدان میں بھی نئی تہذیب کا حصہ مجموعی طور پر منفی اور تخریبی رہا اس کے اثر سے تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ماضی سے

بیزار ہو گئے لیکن اپنے مستقبل کی تشکیل کا کوئی تصور نہ قائم کر سکے۔ انھوں نے اپنے آباؤاجداد کی نقل ترک تو کر دی۔ مگر تقلید پرستی ذہن میں ایسی بسی کہ اس سے بدتر ذہنی غلامی میں گرفتار ہو گئے۔ کالونی کے انگریزی زندگی کو دور سے دیکھ کر اس کی بری بھلی کو انھوں نے اپنا تہذیبی نصب العین بنا دیا۔"(۱۰)

انگریزوں نے برصغیر میں ہندوستانی تہذیب کو مسمار کر دیا۔ تہذیب و ثقافت کی نقل کرنے والے اجسام منظر عام پر لائے۔ یہ اجسام تعلیم یافتہ انگلش لباس پہنتے آپس میں انگریزی زبان خراب لہجے میں بولتے، گھروں کی تعمیر آرائش، انگریزی کرواتے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھے انگریزوں کی حرکات و سکنات کی نقل کرتے۔

نو آبادیاتی نظام سے مذاہب میں تبدیلی کارونما ہونا فطری عمل ہے۔

برصغیر میں اسلام ہندو مذہب، سکھ مذہب، عیسائی مذہب تھے۔ انگریزوں نے فوجداری دیوانی، آئینی اور تجارتی قوانین کا جو مجموعہ تیار کر رکھا تھا اس کی بنیاد انگریزی قانون پر تھی۔ مذہبی زندگی اور خیالات و احساسات پر نو آبادکاروں کی حکمرانی ان کے سامراجی ڈھانچے کی تشکیل کا اہم پہلو تھا۔

قوانین کی تبدیلی سے ہندوؤں اور مسلم میں فکری پیچیدگیاں رونما ہوئیں جن کی تصدیق ان کے مذاہب سے نہ ہوتی تھی۔ عیسائی مذہب کے لوگ عیسائیت کا پرچار برصغیر میں کر رہے تھے، عیسائیت کی فضیلت پر پمفلٹ، کتابچے شائع ہو رہے تھے۔

اس لیے ہندو اور مسلمان اپنے عقائد کے تحفظ کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ برصغیر کو عیسائیت اور مغربیت کے ذریعے تہذیب یافتہ بنانے کی خواہش انگریزی تعلیمی پالیسی کو ایک اہم پہلو تھی۔

افتخار عالم خان کہتے ہیں کہ:

"انگریزی تعلیم کا ہندوؤں پر بہت اثر ہوا۔ کوئی ہندو جو انگریزی دان سے کبھی سچائی سے اپنے مذہب پر قائم نہیں رہتا، کچھ لوگ مصلحتاً ہندو رہتے ہیں مگر اکثر یا تو مرتد ہو جاتے ہیں یا عیسائی مذہب قبول کر لیتے ہیں۔ میرا تو پختہ عقیدہ ہے کہ ہماری اسکیم اگر پورا عمل در آمد کیا گیا تو بنگال میں ایک بھی ہندو نظر نہیں آئے گا۔"(۱۱)

نو آبادیاتی نظام کی وجہ سے برصغیر میں بہت سی منفی تبدیلیاں منظر عام پر آئیں۔ انگریزوں نے لسانی، مذہبی اور نسلی فرقہ پرستی سے قومی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔

برصغیر کے باشندوں کو کاہل، وحشی غیر مہذب گردانتے ہوئے ذہنی محکوم بنایا، جس کی وجہ سے مقامی لوگوں نے اپنی تہذیب و ثقافت اور روایات کو کمتر اور گھٹیا محسوس کیا۔ انگریزوں نے اپنی مصنوعات کے لیے چھوٹی گھریلو صنعتوں کو داغ دار کیا، جس کی وجہ سے ذہنی غلامی والی نسل تیار ہوئی۔ بہت سے لوگ ذہنی کرب اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا نظر آئے۔

انگریزوں نے اپنی زبان انگریزی کو وسعت دی جس سے مقامی افراد اپنی زبان کو روایتی اور فرسودہ محسوس کرنے لگے، جس کی وجہ سے انہوں نے مغربی تہذیب و ثقافت کو شعوری اور لاشعوری طور پر اپنانا شروع کیا۔

انگریزوں نے برصغیر کے چندان نوجوانوں کو اہمیت دی جو انگریزی زبان جانتے تھے، جس سے بے روزگاری عام ہوئی۔ غذائی اجناس کی پیداوار کی بجائے انگریزوں نے کثیر پیداوار سے قحط کی صورت حال رونما کی۔

انگریزوں کا برصغیر کی قوم کو اپنے جیسا انسان نہ سمجھنا استحصالی رویوں میں سے سر فہرست تھا۔ جدید تعلیم، انگریزی زبان کے ذریعے برصغیر کے لوگوں کو ذہنی اور جسمانی غلام تصور کیا گیا۔ سہولیات دینے کے نام پر وسائل پر قبضہ کیا گیا۔

نو آبادیاتی نظام سے اہل برصغیر نے آزادی کے لیئے مختلف تدابیر اور جد وجہد کی، اُس وقت وفاداری اور حریت کی مثال ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ جنہوں نے مصلحت کی فضا سے اپنوں اور غیروں کی مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے ثابت قدمی، وسائل کے فقدان کے باوجود تہذیبی و تمدنی، اخلاقی، تعلیمی معاشرتی، سیاسی، قومی واصلاحی سرگرمیوں کی میں حصہ لیا۔ دور حاضر میں بظاہر نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو گیا ہے لیکن عالمی سامراج نے معاشی اور تعلیمی سطح پر آزاد ممالک کو اپنا پابند بنا کر غلام بنانے کے احکامات بھی جاری کئے ہوئے ہیں۔

نو آبادیاتی نظام کے بعد نو آبادیاتی سیاست نئے روپ میں منظر عام پر آگئی ہے، جیسے کہ نائن الیون کے بعد مسلمانوں کی عزت کو داغ دار کرنا، ڈرون سے حملے اور تعلیمی نظام کی دہشت گردی، دیگر ممالک کے قرضے کی گرفت سر فہرست ہیں۔

(ب) وکٹوریائی تصور اخلاق

تصورِ اخلاق وہ معاشرتی پیمانہ ہے جس سے معاشرے کے حُسن وقبح کو ماپ سکتے ہیں۔ وکٹورین تصور اخلاق معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار کی از سر نو تشکیل کا تصور ہے۔ وکٹورین دور ۱۸۳۲ء سے لیکر ۱۹۰۱ تک کا دور ہے۔ اس برطانوی دور میں ملکہ وکٹوریہ نے کرداری اور اخلاقی اقدر و معیار کو بحال کیا جو وکٹورین دور کی پہچان بنیں۔

وکٹورین تصور اخلاق کے ذیل درج نکات ہیں۔

۱۔ تہذیبی واخلاقی تصورات

۲۔ سیاسی و سماجی تصورات

۳۔ اخلاقی اقدار

تہذیبی واخلاقی تصورات	سیاسی وسماجی تصورات	اخلاقی اقدار
مادی ترقی، میکانکی ترقی، سائنسی ترقی	جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ، جمہوری اصلاحات، اقتصادی مسائل کی بازگشت۔	مساوات وبرابری، انسانیت سے پیار، مادی اشیاء سے نفرت۔
لسانی ونسلی تعصب کا خاتمہ، طبقاتی تقسیم ظلم وجبر کا خاتمہ	عدالت کے غیر منصفانہ رویوں پر اصلاحات، ناجائز عدالتی قوانین کا خاتمہ۔	معاشرتی انتشار کا خاتمہ، قیدیوں کے حقوق۔
انسانی تشدد کی روک تھام، انسانی سفاکی پر پابندی	مزدوروں اور فیکٹریوں کے حقوق کے لیے ایکٹ متعارف۔	اعتدال پسندی، قیدیوں کی زندگی میں امید کی کرن اور رمق پیدا کرنا۔
اخلاقی حساسیت، معاشرتی اقدار اور فنون کے حوالے سے تصوف، رومانویت	عوام میں نشاط انگیز ہنگامی حالات کی روک تھام۔	انسانی ہمدردی، تحمل اور وقار کے نئے زاویوں کی تشکیل۔
صنعتی اصلاحات، حق رائے دہی کی وسعت	محنت کشوں کے معاوضے میں اضافہ، معاشرتی ساخت میں خرابیوں کی وجہ اور اس کا حل۔	غلامی کے خاتمے کی مہم، مویشیوں کے لیے ایکٹ۔
اعلیٰ اخلاق کے لیے مذہبی مہم کا آغاز	چھوٹے عمر کے کارکنوں کی حالت بہتر کرنے کے لیے اصلاحات	چائلڈ لیبر کا خاتمہ بچوں کو سزا نہ دینا۔
اخلاقی نقطہ نظر کی کشیدگی کو ختم کرنا	شمالی صنعتی قصبوں کے اندوہناک حقائق کی بازگشت، سیاسی اصلاحات۔	مذہبی امور کے لیے اتوار کے دن کا تعین۔
ادبی کتابوں میں فحاشی کو خارج	انسانی سمگلنگ کو بین، غلامی میں جانے والوں کی آزادی۔	ہم جنس پرستی کا خاتمہ۔
جسم فروشی کا خاتمہ، عوامی برائیوں کا خاتمہ، لالچ وانصافی	تعلیم بالغاں۔	لکھاری خواتین کو آزادی۔

ا۔ تہذیبی واخلاقی تصورات

مغربی تہذیب مادیت کی تہذیب ہے، اس تہذیب میں مقصدیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مغربی تہذیب واخلاقی تصورات کے منظر نامے پر روشنی ڈالیں تو اول درجے پر صنعتی ترقی، مادی ترقی، میکانکی ترقی اور سائنسی ترقی نظر آتی ہے۔

مادی ترقی سے مراد سائنسی ایجادات، تکنیکی تحقیق اور ان کا اطلاق ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اوائل تک چھوٹی چھوٹی صنعتیں تھیں، لیکن تحقیق کے ذریعے نئی ایجادات نے اجتماعی و منظم کارخانوں کو فروغ دیا، جس میں مشینوں کے ذریعے بڑے پیمانے کی پیداوار ممکن ہو سکی. برطانوی جغرافیائی محل وقوع صنعتی انقلاب کے لئے ایک مضبوط بنیاد بنا۔ چاروں سمت سمندر سے گھرے ہونے کے سبب اس کے چاروں طرف کئی بندرگاہوں کا فروغ ہوا۔ برطانیہ کے مختلف شعبوں میں سائنسی پیش رفت اور مشینی ایجادات نے صنعتی ترقی کو عالمگیر شکل دی۔

جوہنکے نامی مشہور انگریز نے کپڑا بننے کی مشین ایجاد کی۔ Johankay اس ایجاد نے کاتے گئے سوت کی مانگ میں بے تحاشا اضافہ کیا۔ کپڑے کے لیے جدید مشینیں بنائی گئیں جو آٹھ گنا زیادہ سوت کات سکتی تھیں۔ اس کے بعد ترقی کے نتیجے میں سوتی کپڑا رنگائی کی ضرورت کی طرف دھیان گیا جس سے مختلف کیمیائی صنعتوں نے فروغ پایا۔ اہم کیمیائی فارمولا کلورین کی کھوج ہوئی جس کی وساطت سے کم وقت میں سوت کی رنگائی کا کام ممکن ہو پایا.

جیمس واٹ نے بھاپ کا انجن ایجاد کیا جو کہ اہم پیش رفت ثابت ہوئی اس کے ذریعے صنعتوں کو کم خرچے پر ہی محفوظ ایندھن کی سپلائی ممکن ہو سکی۔ میکانکی ترقی میں برطانیہ کی مثال نہیں، مضبوط بحری جہاز کی وساطت سے فوج نے بھی فائدہ حاصل کیا اور اس سے تجارت کے موثر طریقے بھی رائج ہوئے۔

صنعتی انقلاب میں ریلوے انجن بھی شامل ہے۔ 1856 میں ریلوے کی لمبائی دو سو اٹھاسی میل تھی جو 1869 میں چار ہزار میل اور 1890 میں اٹھائیس ہزار میل ہو گی تھی، تار کی لائنوں میں اسی سرعت سے اضافے ہوئے، ان کی لمبائی 1891 میں 37 ہزار میل اور بعد میں 74 ہزار میک ہو گئی تھی۔

سائنسی ترقی، ایجادات میں دخانی جہاز، جیٹ انجن، پہلی صنعتی سپننگ مشین، پہلا کمپیوٹر ،انٹرنیٹ، سیٹ بیلٹ، برقی موٹر، دخانی انجن شامل ہیں. میڈیکل سائنس میں چیچک کی ویکسین سر فہرست ہے اس کے بعد انتقال خون کا پہلا تجربہ ،اس کے علاوہ تعلیمی و علمی ترقی میں یورپی جامعات سر فہرست رہی ہیں۔ کیمرج یونی ورسٹی، امپیریل کالج، آکسفورڈ یونی ورسٹی، یونی ورسٹی کالج لندن، سکول آف اکنامکس نمایاں ہیں۔ معاشی ترقی میں صنعتوں کے علاوہ بنک ، تحقیق کا نیا طریق ،زراعت کا محکمہ ،نہری نظام، زرعی نظام، مویشیوں کی افرائش نسل کے فارم سر فہرست ہیں۔ جنوبی افریقہ میں جو کہ ابتدائی دور میں ڈچ کالونی تھا، مختلف یورپی اقوام کے باشندے آکر آباد ہوئے اور زمینوں پر قبضہ کر کے مقامی قبائل کو بے دخل کر دیا۔

1905 میں آکسفورڈ یونی ورسٹی میں برطانیہ کی نوآبادیاتی پالیسی کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک تحقیقی ارادہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے مورخوں نے ان نوآبادکاروں میں جہاں انگریز جا کر آباد ہوئے تھے۔ امن وامان کے انتظام کے لیے یہ تجاویز پیش کیں کہ نسل کی بنیاد پر سفید فام لوگوں کو مقامی باشندوں سے علیحدہ رکھا جائے اور وہ ملازم جوان نوآبادیوں میں کام کرتے ہیں ان کے ساتھ نسلی تعصب کا برتاو نہ کیا جائے۔

وکٹوریائی دور میں تہذیبی واخلاقی تصورات کی بنیاد طبقاتی تقسیم کے حوالے سے دو اہم پہلوؤں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک طبقہ اخلاقی اقدار کی بنیاد انسانیت کو جبکہ دوسرا طبقہ آفاقی سچائیوں کو بنیاد مان کر معاشرے کے اخلاقی حدود و قیود کا مقام متعین کرتا ہے۔ وکٹوریائی سوسائٹی کو اخلاقی و تہذیبی اقدار کے مطابق درجہ بندی کے ذریعے منظم کیا گیا۔ نسل، مذہب، علاقہ اور پیشہ شناخت اور حیثیت کے پہلو متعین کیے گئے۔ وکٹوریائی دور میں سماجی طبقات میں اعلی کلاس ،مڈل کلاس، اور نچلا طبقہ شامل تھے۔ شاہی لوگ اعلی طبقہ میں تصور ہوتے تھے۔ درمیانی طبقہ میں اہم افسران اور سردار وغیرہ اور لوئر نچلے طبقے میں امیر آدمی کاروباری مالکان وغیرہ، مڈل کلاس لوگ جن کے پاس ملازمتیں تھیں، شامل تھے۔

رسالے میں ہے کہ: Black Cat Readers

> "The society of the Victorian age was divided into two main classes: the high class (the rick) and the low class (the poor).in general terms. The rich lived in

> spacious homes, surrounded by lush, well-kept gardens and had plenty of servants. (12)

وکٹوریائی دور کے تہذیبی واخلاقی تصورات میں اہم عنصر اخلاقی حساسیت ہے۔اخلاقی حساسیت سے مراد، کسی اخلاقی مسئلے کو جذبے اور شعور کی سطح پر اخلاقی مسئلہ سمجھنااور اس کے سلسلے میں حساس ہونا۔اخلاقی حساسیت کی تین قسمیں ہیں پہلی یہ کہ تخریبی فعل، قول اور فکر سے گریز کرنا۔دوسری قسم مثبت اعمال میں شمولیت ہے۔تیسری قسم دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ملکہ وکٹوریہ نے وکٹوریائی تہذیبی واخلاقی اقدار میں اخلاقی حساسیت کے معاملات کو پیش کیا ۔وکٹوریائی تہذیبی واخلاقی تصورات میں اہم سرچشمہ یہ ہے کہ اخلاقی اقدار میں مذہب، معاشرتی اقدار اور فنون کے حوالے سے رومانویت اور تصوف کو پیش کیا گیا۔

وکٹوریائی تہذیبی واخلاقی تصورات میں اہم نقطہ صنعتی اصلاحات نمایاں ہے ،کارکنوں کو مشینوں سے زیادہ وقعت دی جائے گی،لوگ مشینوں سے بڑے ہیں وہ خود مشینیں بناتے ہیں.وکٹوریائی تہذیبی واخلاقی تصورات میں اخلاقی نقطہ نظر کی کشیدگی کو ختم کرنااہم جزوِماناگیاجس میں اس بات کی آگاہی کو منظر عام پر لایا گیا کہ قوم کازوال اصل میں اخلاقی زوال سے شروع ہوتا ہے اگر معاشرے میں نازیباالفاظ استعمال ہو رہے ہوں تو وہ معاشرتی اخلاقی پستی کی طرف زوال پذیر ہو جاتا ہے.ملکہ وکٹوریہ کی اس مہم کا مقصد اخلاق وکردار کی بلندی کو پیش کرنا تھا جس سے معاشرہ پر امن ہو سکے۔جنسی موضوعات کے مظاہر مبنی مواد کو فحش نگاری یا فحاشی کہتے ہیں، فحش نگاری میں متنوع وسائل استعمال ہوتے ہیں۔جن میں،رسالے،خاکے،صوتی سجل شامل ہیں۔طباعت کی ایجاد کے بعد فحش نگاری کتابوں کے ذریعے سے پھیلنا شروع ہوئی۔فحاشی ایک عظیم جرم ہے جس کی حرمت وندامت ہر سابقہ وامن قدیمہ کے قبائل نے کی۔وکٹوریائی تہذیبی واخلاقی تصورات کااہم پہلو اخلاقی اقدار کی بہتری کے لیے ادبی کتابوں میں فحاشی کو خارج کرنا ہے۔

ویکیپیڈیا کے مطابق:

"Current plays and All Literature including Old classic Like Shakespeare were cleansed of content considered to be inappropriate for children,Bowdlerized"(13)

جسم فروشی یا عصمت، قحبہ گری فحاشی کے اس کاروبار کو کہتے ہیں جس میں رقم کے عوض جسم پیش جاتا ہے۔وکٹوریائی تہذیبی و اخلاقی تصورات میں اہم نقطہ یہ ہے کہ ملکہ وکٹوریہ نے جسم فروشی کو غیر انسانی قرار دیا،ان کے مطابق اس عمل کے دوران طوائف اور اس کو استعمال کرنے والے مرد انسانی مقام و مرتبہ سے گر جاتے ہیں۔ جسم فروشی ایک پر تشدد اور منظم استحصالی نظام ہے،اس نظام سے پیدا ہونے والی خرابیوں کے فروغ سے دیگر جرائم جنم لیتے ہیں۔۔

ایک متوازن اور صحتِ مند معاشرے کی تشکیل تب ممکن ہے جب اس میں عوامی برائیوں کا خاتمہ کیا گیا ہو، جس معاشرے میں عوامی برائیاں لالچ، حسد نہیں ہوتے وہ معاشرے سراپا جمال ہوتے ہیں اور درجہ کمال تک پہنچ جاتے ہیں، معاشرے کی خوبیاں وہ جوہر ہیں جو معاشرے میں بسنے والوں کو ہر کام کا اہل بنا دیتے ہیں اور ہر انسان کی طبعیت میں گہرائی، سوجھ بوجھ اور مہارت پیدا کرتی ہیں۔ جب افراد نخوت اور حرص و ہوس سے پاک اور جذبات خیر و احسان سے مملو ہوں تو ان افراد کی شخصیت انسانیت پر فائز ہوتی ہے جس سے اجتماع یعنی کہ معاشرے میں خیرات و حسنات کی بہار آتی ہے۔ وکٹوریائی تہذیبی و اخلاقی تصورات میں ناانصافی لالچ جیسے عوامی برائیوں کا خاتمہ بھی شامل ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے ایسی اخلاقی اقدار کو پروان چڑھایا جس میں تعلیم، دولت اور شہروں کی اصلاحات کر کے سماج کی اصل شکل ظاہر کی۔

2۔ سیاسی و سماجی تصورات

وکٹوریائی سیاسی و سماجی تصورات کی امتیازی خصوصیت سول قانون کا ارتقاء ہے جو فرد کے احترام اور انسانی عظمت کے احساس کا نتیجہ ثابت ہوا۔ شخصی آزادی وکٹوریائی دور کی اہم مزین کامیابیوں میں شمار ہوتی ہے وکٹوریائی اخلاقیات نے شخصی اور سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ اقتصادی آزادی کو اپنے تصورات کا اہم جزو بنایا۔ مادی تمول اور وسائل کی افراط اسی اقتصادی آزادی کی بدولت وکٹوریائی معاشرے کو حاصل ہوئی۔ وکٹوریائی دور کی ترقی اور سیاسی اور سماجی تصورات کی اعلیٰ خصوصیات کے روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تصویر کا دوسرا رخ سامراجیت پسندی،

جاگیرداری نظام اور اقتصادی نشیب و فراز کی باز گشت ہے۔وکٹوریائی تصور اخلاق انسان دوستی، آزادی، برداشت و رواداری، آزادی اظہار کا علمبر دار ہے۔

برطانوی حکمت عملی کا یہ مظہر تمدن،علوم جدیدہ اور انسانی اقدار کی ترویج کا نام ہے۔وکٹوریائی سماجی تصورات میں تعلیمی نصابوں سے لیکر عملی زندگی کے تمام شعبوں کو منظم کرتا ہے،معاشرتی تعزز کے لیے وکٹوریائی طرز زیست اور مخصوص آداب شرط بن کر منظر عام پر آئے.وکٹوریائی سماجی تصورات کے ذریعے فکری سطح پر تبدیلی رونماہوئی اور وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ طبقوں میں مغربی علوم کے زیر اثر شعور کی بیداری اور سیاسی و سماجی بیداری ایک لازمی جزو بن گئی۔جس کی بدولت اساسی آزادی،جمہوریت اور انہی تصورات نے آخر کار تعلیم یافتہ اذہان کو منور کر کے ایک واضح منزل کا تعین کیا.وکٹوریائی سیاسی و سماجی تصورات نے سیاسی اتھل پتھل کو رفتہ رفتہ سیاسی بیداری کی صورت دی۔نظام حکومت میں انقلابی تبدیلیاں آئیں اور برطانوی سامراج نے حکومت سنبھالنے کے ساتھ اپنے نظام تعلیم اور سیاسی و سماجی تصورات متعارف کرائے اور انہیں لاگو کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔جس سے لوگوں کے طرزِ زندگی میں بڑے پیانے پر تبدیلی واقع ہوئی اور مغربی طرزِ معاشرت کو مقبولیت حاصل ہوئی۔وکٹوریائی سماج میں آنے والی تبدیلیاں ہمہ جہت تھیں اور سیاسی و سماجی،معاشی اور معاشرتی سطح پر تبدیلی کے علاوہ اذہان اور افکار بھی نئی روشنی سے منور ہو سکے۔وکٹوریائی سیاسی و سماجی تصورات کا اہم جزو معاشرتی اونچ نیچ کی باز گشت کا اعلان ہے۔

ملکہ وکٹوریہ نے ناجائز عدالتی قوانین اور عدالت پر طنز کے ساتھ ساتھ عدالتوں کی فیصلوں میں تاخیر اور غیر منصفانہ فیصلوں پر قوانین متعارف کرائے جس سے قیدیوں کی تلخ اور دکھ بھری زندگی میں امید کی کرن اور زندگی سکون سے گزارنے کی رمق پیدا ہوئی۔ہنگامی حالات سے مراد قدرتی آفت ہے جو کسی بھی قدرتی خطرے سیلاب،آتش فشاں،زلزلے سے رونما ہو سکتی ہے۔ملکہ وکٹوریہ کے سیاسی و سماجی تصورات کا اہم حصہ ہنگامی حالات کی روک تھام ہے۔ملکہ وکٹوریہ نے ہنگامی حالات سے متاثرہ افراد کی مدد کے لیے مہم چلائی۔ملکہ وکٹوریہ نے رضاکاروں اور سماجی حلقوں کے ذریعے غریب لوگوں کی مالی معاونت کے لیے منظم نظام کا قیام کیا جس سے غریب بیوہ،بے سہارا خواتین معاشرے میں اہم کردار ادا کر سکیں.پیٹر شیلی معاشرتی تاریخ کے رسالے میں لکھتا ہے کہ

> "The utility of charity as a means of Boosting One's social leadership was socially Determined and would take a person Only so far. (14)

وکٹوریائی تصور اخلاق کے سماجی تصورات میں اہم نکتہ محنت کشوں کے حقوق و فرائض کا تعین ہے۔ محنت کش لوگ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ بعض لوگ محنت کشوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ملکہ وکٹوریہ نے محنت کشوں کے حقوق کا تعین کیا، جس کا پہلا جزو انکی "عزت کا تحفظ" ہے۔ محنت کش لوگ معاشرے کی طرف سے عزت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ معاشرے کو ان کے ہنر اور پیشوں کی وجہ سے ان کی عزت اور احترام کرنا چاہیے اور ان کی غربت اور کام کی وجہ سے ان کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ محنت کشوں کے حقوق کا دوسرا جزو "اجرت کی صحیح طریقے سے ادائیگی" ہے۔ محنت کشوں کی اجرت کو بروقت ادا ہونا چاہیے۔ محنت کشوں کے حقوق کا تیسرا جزو "جان کا تحفظ" ہے چوتھا جزو "انصاف کی فراہمی" ہے۔ محنت کشوں کو بھی معاشرے کے دیگر طبقات کی طرح انصاف ملنا چاہیے۔ معاشرتی ساخت میں خرابیوں کی اہم وجہ معاشرتی مسائل ہیں۔ معاشرتی مسئلے انحراف پر مبنی رویوں کا نام ہے جو لوگ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کسی خاص سمت میں معاشرے کے بتائے ہوئے حدود سے باہر ہو کر اپناتے ہیں۔ معاشرتی مسائل سے مراد ایک ایسی حالت ہے جس میں رائج کردہ قوانین سے انحراف کیا جاتا ہے۔ معاشرتی مسائل کی وجہ سے معاشرے جارحیت اور عداوت سے فروغ پاتے ہیں. وکٹوریائی دور کے سیاسی و سماجی تصورات میں اہم عنصر معاشرتی مسائل و انتشار کو ختم کرنا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے مختلف پہلوؤں سے معاشرتی ساخت میں خرابیوں کی وجہ کو جانچا اور ان کا قلع قمع اپنے وضع کردہ تصورات سے کیا۔ بچے کسی معاشرے کے مستقبل کا سرمایہ ہوتے ہیں، حالات کے جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ بچے مشقت کرنے لگ جاتے ہیں تو اس معاشرے کے لئے ایک المیہ نمودار ہو جاتا ہے، یہ بعد ازاں فروغ پا کر ناسور کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب معاشرتی بچوں کو ناگزیر تسلیم کر لیتا ہے تو یہ اس معاشرے کے زوال کی پہلی سیڑھی ہوتا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں انگلستان کے صنعتی انقلاب کے ساتھ بچوں کی جسمانی محنت و مشقت میں اضافہ ہو گیا جس سے بچے جسمانی اور عصبی لحاظ سے کمزور ہو گئے بچوں کی شرح اموات میں اضافہ ہو گیا۔ حالات کی سنگینی اس بات سے دیکھی جا سکتی ہے کہ کانوں اور غاروں میں کان کنی کے لیے معصوم بچے بھرتی کئے گئے جو کانوں میں رینگ رینگ کر کان کنی کرتے۔ اٹھارویں صدی میں ایک لاکھ سے زائد بچے گھروں میں ملازم تھے۔ یہ گھریلو ملازم ایک ہفتے میں اسی گھنٹے تک کام کرتے تھے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ

TH-27375

یورپ کے صنعتی انقلاب میں معصوم بچوں کی محنت، مشقت کا بہت زیادہ کردار تھا۔ بیسویں صدی کی شروعات میں شیشے کی صنعت میں بچے بھرتی کئے گئے، شیشے کی صنعت بچوں کی صحت اور عمر کے لئے زہر قاتل ثابت ہوئی۔ وکٹوریائی سماجی تصورات میں اہم رکن چھوٹی عمر کے کارکنوں کی حالت بہتر کرنے کے لیے اہم اقدامات اٹھائے گئے۔

جارجینا بیٹ اسکومب شیفٹری مشرق کی ساتویں سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ:

> "In 1833 he introduced the ten hours Act 1833 which provided that children working in the cotton and Woolen Mills must be aged nine or above no person Under the Age of eighteen was to Work more than ten hours a day. Act of 1844 said. children 9-13 years could Work for at most 9 hours a day with a lunch break". (15)

تعلیم بالغاں ایک ایسا تدریسی طریقہ کار ہے جس کے تحت بالغ افراد کو بنیادی تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم بالغاں میں بنیادی حرف شناسی، لفظوں کی تشکیل، اصول نحو و قواعد، جملوں کے بنانے کی باریکیاں شامل ہوتیں ہیں۔ تعلیم بالغاں کا بنیادی مقصد ان لوگوں کے لئے دوسرا موقع فراہم کرنا ہے جو معاشرے میں غربت یا ناانصافی یا تعلیم تک رسائی کے حصول کے لئے دیگر وجوہات کی بناپر تعلیم سے محروم ہو گئے ہوں۔ وکٹوریائی سیاسی و سماجی تصورات کا اہم جزو تعلیم بالغاں بھی ہے۔ انسانی سمگلنگ سے مراد، لوگوں کی نقل و حمل، منتقلی، پناہ نگاہ یا وصولی کے ذریعے زبردستی، منافع کے لئے انسانوں کا استحصال کرنا ہے۔ دنیا بھر میں ہر عمر اور تمام مرد، عورتیں اور بچے اس جرم کا شکار ہوتے ہیں اسمگلرز انسانوں کو پھنسانے اور زبردستی کرنے کے لئے اکثر تشدد یا دھوکہ دہی سے بھرے روزگار اور تعلیم اور ملازمت کے جھوٹے وعدوں کا استعمال کرتے ہیں۔

اسمگلرز انسانوں کو کنٹرول کرنے کے لئے جسمانی اور جنسی زیادتی، بلیک میل، ہیرا پھیری کا استعمال کرتے ہیں ۔وکٹوریائی سیاسی و سماجی تصورات میں اہم عنصر انسانی سمگلنگ کی روک تھام ہے ملکہ وکٹوریہ نے وقار کے نئے زاویے تشکیل دیے۔ جس میں انسانی سمگلنگ کو بین کیا گیا۔ رائل نیوی نے کشتیوں کی چھان بین شروع کی۔ انسانی سمگلنگ کے ذریعے غلامی میں جانے والے لوگوں کو آزاد کرایا۔ ویکیپیڈیا کے مطابق:

> "The Royal Navy patrolled the Atlantic Ocean stopping any ships that it suspected of trading African slaves to the American and freeing any slaves found."(16)

جب انسان کو ذہنی اور نفسیاتی اور جسمانی طور پر ملکیت میں لے لیا جائے تو اسے غلامی کہتے ہیں۔ غلامی میں لانے کا موثر طریقہ معاشی حکمرانی ہے جس سے انسانوں کو ذہنی اور نفسیاتی، جسمانی طور پر غلامی کے اندھیرے میں دھکیلا جاتا ہے۔ غلامی کی مختلف شکلیں نمایاں ہیں۔ جن میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور اور زرعی فارموں اور ماہی گیروں کے شعبے میں کام کرنے والے مردوں کے علاوہ خواتین بھی شامل ہیں جن سے جبراً جسم فروشی کروائی جاتی تھی، جب وہ ان کاموں سے ناکارہ ہو جاتیں تو ان کے جسمانی اعضاء بیچ دے جاتے اور بچوں سے سڑک پر بھیک منگوائی جاتی۔

3۔ اخلاقی اقدار:

اخلاقی اقدار ایک ایسا نظام ہے جو خوشگوار زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ اخلاقی اقدار معاشرے کے ذریعے فرد میں منتقل ہوتا ہے، اخلاقی اقدار درست اور غلط کی تمیز کرنا بتاتا ہے۔ اخلاقی اقدار میں دیانتداری، احترام، احسان، رواداری، سخاوت اور عاجزی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ وکٹوریائی تصور اخلاق مساوات و برابری کا درس دیتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے مادی اشیاء سے نفرت اور انسانیت سے پیار، اعتدال کا درس دیا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے اخلاقی اقدار کو تجربہ کار مہم بنا کر معاشرے میں مستقل نقش ثبت کئے ہیں۔ معاشرے میں بدحالی اور غیر متعصبانہ رویوں نے جنم لیا، ملکہ وکٹوریہ نے اپنے وضع کردہ اخلاقی اقدار میں جذباتیت کو ابھار کر مایوسی اور دکھ کے برعکس امید کی کرن کو پیدا کیا۔ وکٹوریائی اخلاقی اقدار میں حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے تحفظ کا مکمل خیال رکھا۔ ملکہ وکٹوریہ نے قیدیوں کے ساتھ عام انسانی احترام میں کمی نہیں کی۔ وکٹوریائی اخلاقی اقدار میں قیدیوں کے لئے انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے قانون بنایا کہ قیدیوں کو زندہ رہنے کے لئے مناسب غذا، صاف پانی سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔ ان کے علاج و معالجہ، حفظان صحت کے لیے ورزش و تفریح وغیرہ ضروریات زندگی کی تکمیل کی انھیں مکمل اجازت ہو گی۔

وکٹوریائی تصور اخلاق میں داخل مذہبی امور پر کبھی تعرض نہیں کیا جائے گا، قیدی جس مذہب کو مانتا ہے اس کے مذہب کے پیشواؤں اور کتابوں کی توہین نہ کی جائے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات اور انسانی بنیادی حقوق میں آزادی شامل ہو۔ ملکہ وکٹوریہ کے اخلاقی پہلو میں یہ نمایاں ہے کہ اتوار کا دن مختلف مذہب کی مذہبی امور کے لئے خصوصیا قیدیوں کے لئے مختص کیا گیا۔ وکٹوریائی اخلاقی اقدار میں جانوروں پر ظلم کی روک تھام اور فلاح وبہبود کے لئے قانون سازی متعارف کروائی گئی۔ کچھ لوگ شرط لگا کر ریچھ اور کتے کی لڑائی کرواتے ہیں اور تماشا لگا کر لطف حاصل کرتے ہیں۔ مرغوں کی لڑائی، کتوں کی لڑائی، جس سے جانوروں کا نقصان ہوتا تھا خون ریزی اور ظلم کے روپے تھے اس کے خلاف ملکہ وکٹوریہ نے ایکٹ 1822 تشکیل دیا، جس میں جانوروں کے حقوق متعارف کروائے گئے۔

جانوروں کے مسائل پر نقطہِ نظر کی وضاحت کرنے کے لیے مختلف قسم کی شرائط وضع ہوئے، جس میں جانوروں کا تحفظ جانوروں کی وکالت اور آزادی شامل ہے۔

وکٹوریائی اخلاقی اقدار میں میٹرو پولیٹن کا آغاز بھی شامل ہے۔ میٹرو پولیس کا کام جانوروں کا تحفظ کرنا ہے۔ میٹرو پولیٹن پولیس کو اختیار دیا گیا کہ پاگل کتوں کے خاتمے کو یقینی بنائے، کتوں کے پیچھے چھکڑے لگا کر جو کام لئے جاتے اس کو ممنوع قرار دیا گیا۔ وکٹوریائی اخلاقی اقدار میں جانوروں کے درد اور حقوق کے بارے میں جیمز ٹرنر لکھتا ہے کہ

> "Introduced the first legislation to prevent cruelty to animals, the cruel treatment of cattle Act 1822:it pertained only to cattle and it passed easily. (17)

ہم جنس پرستی سے مراد ایک ہی جنس کے حامل افراد کے مابین پائے جانے والی رومانوی کشش، جنسی رویہ ہے۔ ہم جنس پرستی جس طرح انسان کی روحانی زندگی کے لئے قاتل ہے۔ ایسے ہی انسان کی جسمانی زندگی کے لئے بھی انتہائی نقصان دہ ہے۔ ایڈز ایسی بیماری ہے جو اس بد چلنی کی وجہ سے پھلتی ہے۔ یہ جسم کے دفاعی نظام کو کمزور کرتی ہے اور یہ چھوت کی وجہ سے ایک دوسرے کو لگتی ہے۔

وکٹوریائی تصور اخلاق میں ہم جنسیت کا خاتمہ کیا گیا، ہم جنس پرستی سے ہونے والی بیماریوں کو منظر عام پر لایا گیا اور اس کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ ہم جنس پرستی میں مرتکب ہونے والے مردوں کو دو دو سال کی سزائیں سنائی گئیں۔ شان بریڈی ہم جنس پرستی کے بارے میں کہتے ہیں کہ :

> "The enormous especially in Victorian era produced A sharp Rise in prosecution for illegal sodomy at midcentury. (18)

وکٹوریائی اخلاقی اقدار میں جنسی جبر، جنسی تشدد کے خلاف جنگ اور اخلاقی خوبیاں نمایاں ہیں۔

وکٹوریائی اخلاقی اقدار میں لکھاری خواتین کو اپنے نام سے تحریریں لکھنے کی آزادی دی گئی۔ وکٹوریائی دور میں جسم فروشی کو سب سے بڑی برائی قرار دیا گیا۔ یہ ایک ایسی برائی ہے جس سے دیگر جرائم جنم لیتے ہیں۔ جوڈتھ واکووٹیز کے مطابق:

> "The reformers started mobilizing in the late 1840s, major news, organization, clergyman and single women become increasingly concerned about prostitution which came to be known as the great evil. (19)

وکٹوریائی تصور اخلاق میں نمایاں اخلاقی اقدار انصاف، آزادی تھے اور عوامی برائیوں کا خاتمہ تھا. وکٹوریائی دور میں ایسی اخلاقی اقدار کو پروان چڑھایا، جس میں تعلیم، دولت اور شہروں کی اصلاحات کر کے سماج کی جائز شکل ظاہر کی گئی۔

حوالہ جات

1. The Oxford English Dictionary.
2. Oxford English Dictionary London in Ania Loomba Colonialism/Post Colonialism, London (1998)p 1

3۔ ایضاً، ص ۲

4۔ فرانٹز فینن افتادگان خاک، مترجم: پرویز، محمد باقر، سجاد، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۳

5۔ سلیم، اشفاق۔ فلسفہ تاریخ، نوآبادیات اور جمہوریت، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۹

6۔ العابدین زین ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض اقتصادی اور مالی پہلو، دہلی: کورونیشن پریس، ۱۹۳۹ء، ۹

7۔ مجید، خواجہ۔ ہندوستان کی اقتصادی تاریخ، دیلی: مینا محل، ۵۱۱، ص ۱۰

8۔ شہر، میلہ۔ میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم، لاہور: طفل آرٹ پرنٹرز، سرکلر روڈ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸

9۔ فرانٹز فینن افتادگان خاک، مترجم: پرویز، محمد باقر، سجاد، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء، ص ۸۳

10۔ حسین، عابد، قومی تہذیب کا مسئلہ، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۰

11۔ عالم، افتخار۔ سرسید اور جدیدیت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۳، ص ۸۱

12 Black cat readers. (n-d) social as pacts of the Victorian age readers: cat black from retried http://www.blackcatreaders.com/media/social/aspects of the Victorian age PDF page

13 Victorian morality Wikipedia http://en.wikipedia.org/wiki/victorian

14 . Peter shapely, charity, status and leadership-charitable image and the Manchester man, Journal of social history 32 # 1 (1998)

15 . Georgina batt Shafterbury: A biography of the seventh east 1801-1885 (1998) p 91

16 . Victorian morality Wikipedia http://en.wikipedia.org/wiki/victorian

17 . Jamesc. Turner. reckoning with the beast: animal, pain and humanity in the Victorian mind (2000) p 39

18 . Sean Brady, masculinity and male homosexuality in Britain 1861-1913.

19 . Judith. Wolkowitz, prostitution and Victorian society, woman class, and state (1982)

باب دوم:

نظم بے نظیر میں سیاسی و سماجی عوامل

الف: برصغیر میں سیاسی فسطائیت کا غلبہ / عروج

ب: سماجی آویزش اور نظم بے نظیر

الف: برصغیر میں سیاسی فسطائیت کا غلبہ / عروج

برصغیر میں مسلمانوں کی ساری شان و شوکت اقتدار کی وجہ سے تھی۔ تمام سیاسی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی تھیں۔ اقتدار کے ختم ہونے کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں ابتری سی پھیل گئی، رہی سہی کسر تعلیمی نظام میں تبدیلی نے نکال دی، مسلمان ہر سطح پر مفلوک الحال اور کسمپرسی کا شکار ہو گئے اور ان کا سیاسی ڈھانچہ بکھر کر رہ گیا۔

مسلمانوں کے لیے نئی حکومت اور نیا نظام ایک عرصے تک نا قابل قبول رہا وہ اپنی عظمت رفتہ کی بازگشت کے لئے کوشاں رہے۔

ہندوں نے اہم سرکاری و غیر سرکاری عہدے اور ملازمتیں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی سطح پر اپنے آپ کو مضبوط بنایا اور انگریزوں کے معاون کی حیثیت سے مسلمانوں کی بدحالی کو شدید تر کرنے کا کوئی موقع نہ جانے دیا۔

مذہب و معاشرت، تہذیب و تمدن، روایات و اقدار قدیم و جدید کے درمیان کش مکش نے جنم لیا انگریزوں نے اس صورت حال میں اپنے تہذیبی اور علمی و فکری تصورات مقبول کرانا شروع کر دیے۔

جس کی بدولت ایسا منظر نامہ منظر عام پر آیا جس میں ٹوٹ پھوٹ اور تعمیر و تشکیل کا عمل بیک وقت جاری و ساری نظر آتا رہا۔

نئے سیاسی منظر نامے نے ہندوستانی معاشرے میں جو ہلچل پیدا کی اس کی بدولت مختلف تحریکوں نے جنم لیا۔

ہندوستان کی دو بڑی قومیں مسلمان اور ہندو دونوں نے اپنے تحفظ و بقا کے لیے واحد راستہ مسلسل جدوجہد کا اپنایا۔

انگریزی مفادات کے تحفظ اور ترویج کے لئے فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور انجمن پنجاب منظر عام پر آئے۔ ان اداروں کے ذریعے انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے علمی و فکری کوششوں کے ساتھ ساتھ اپنی حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے من پسند سیاسی فوائد بھی حاصل کیئے۔

فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم کیا گیا۔ انگلستان سے آنے والے ہندوستانی انتظامیہ کے انگریز افسروں کو مقامی زبان اور کلچر سے واقفیت نہ ہونے کے باعث مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس لیے انہوں نے فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اس مسئلہ کا حل تلاش کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبانیں سکھانے اور معاشرے کے عمومی احوال سے واقفیت دلانے کے لیے جان گل کرسٹ کی نگرانی میں تدریس کا عمل شروع ہوا۔

اردو ادب کا فروغ اس کالج کا مقصد نہیں تھا لیکن مقامی زبان سب سے زیادہ نمایاں تھی اس لئیے اس کے فروغ کے اسباب ہم تک آئے۔ اردو زبان کے قواعد مرتب ہونے کے ساتھ ساتھ لغات لکھی گئیں اور مذہبی و تاریخی کتابوں کے تراجم آسان زبان میں شائع ہوئے۔

انگریزوں نے اپنے افسروں کی تربیت کے ساتھ اس کالج کے لیے ایسی باتوں کو فروغ دیا جو ہندوستانیوں کے لیے سخت ثابت ہوئیں۔ اس کالج نے اردو، ہندی اور بنگالی میں الگ رسم الخط کی تفریق ڈالی۔

اردو کو فارسی اور عربی کا مد مقابل بتا کر مسلمانوں کے تہذیبی نقش کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی۔ شاعری کی بجائے نثر کو فروغ دیا شاعری میں رمز و کنائے میں بہت کچھ کہا جا سکتا تھا، جس سے مسلمان اظہار کی آسانی سے انگریزوں کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔ اس کالج نے تصانیف و تالیفات کے ذریعے ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ کتابوں کے دیباچے انگریزوں کی مدح سرائی پر لکھے گئے۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد دلی کالج کا قیام منظر عام پر آیا۔ اس کا بنیادی مقصد بھی وہی تھا۔ فرق صرف اتنا دکھائی دیتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج انگریزوں کو ہندوستانی زبان اور معاشرت سے آگہی کا نام ہے۔ اس کے برعکس انگریزی تصورات اور علوم کی ترتیب گاہ دلی کالج تھا۔

فورٹ ولیم کالج غیر ملکی (انگریزوں) کی تعلیم کے لیے جب کہ دلی کالج کا مقصد ہندوستانی عوام کو جدید علوم سے آراستہ کرنا اور ان کے قدیم روایات پر جدیدیت کا اثر مرتب کرنا تھا۔ اس دلی کالج کے ذریعے ایک بڑی تعداد جدید علوم پر مغربی تصانیف کے تراجم کی شائع ہوئی۔ کالج میں ذریعہ تعلیم اردو تھا مشکل موضوعات پر اردو زبان میں تحریر و تقریر نے زبان کی غربت دور کرنے میں مدد کی۔ ساتھ جدیدیت کے سبق اس کالج میں طلبہ کو ذہن نشین کرائے گے۔ جنھوں نے ادب کو متاثر کیا۔

مغربی فکر و فلسفہ کو اس دلی کالج کی وجہ سے پذیرائی ملی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاءاللہ جیسے روشن خیال ادیب اس کالج کے پروردہ تھے۔ دلی کالج نے روشن خیالی اور جدید علم کا جو بیج بویا اس کی جڑیں رسائل کے ذریعے ہندوستان میں پھیل گئیں۔

جدید علوم میں عقل کو بنیادی حاصل ہوئی تو وہ مذہب کو پرکھنے کا ذریعہ بنی۔ انگریزی زبان کی ترویج بھی دلی کالج کی بدولت ہوئی بظاہر اس کا مقصد علم کی ترقی تھا لیکن باطن میں کچھ اور تھا۔ اسی کی بدولت اچانک انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنادیا گیا۔

انجمن پنجاب کا قیام ۱۸۷۴ میں عمل میں آیا۔ اس تحریک کے مقاصد قدیم مشرقی علوم کا احیا، صنعت و تجارت کا فروغ، ملک میں اردو زبان کے ذریعے علوم کی اشاعت، علمی وادبی اور معاشرتی وسیاسی مسائل پر غور و خوض، پنجاب اور برصغیر کے دوسرے خطوں کے درمیان روابط اور تعلقات کی استواری تھے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے

مولوی محمد حسین آزاد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے اردو نظم کو مقبول بنانے اور اسے نئی جہت دینے اور نثر میں تازہ کاری پیدا کرنے اور نئے تحقیقی و تنقیدی شعور کی بیداری کا ذمہ لیا۔

انجمن پنجاب کی ایک بڑی مہارت ادبی تنظیم سازی کی تربیت تھی۔ انجمن پنجاب کی علمی و ادبی سرگرمیوں نے اردو ادب کو فروغ دیا، اس کی پالیسیاں اس کا تسلسل کا حصہ تھیں جس کا اظہار فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی صورت میں ہوا۔

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد علی گڑھ تحریک اپنی جذبوں کی ایک بدلی ہوئی صورت تھی۔ علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خان نے مقاصد کے حصول کے لیے قریب وہی راستہ اپنایا جو اس سے قبل راجہ رام موہن ہندو معاشرے کی بقا کے لیئے اختیار کر چکے تھے۔ جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے بالخصوص مسلمانوں کی حالت زار نے سر سید کو قدامت پرستی کی بجائے جدید رجحانات قبول کر کے ترقی کی طرف قدم بڑھانے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے مغربی علوم سے فائدے اور روشن خیالی کو اپنا مطمع نظر بنایا۔ اصلاح کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر قدامت پسندی کی بجائے جدیدیت کے فروغ کی ذمہ داری سنبھالی۔ تہذیب الاخلاق کے اجرا سے ہی سر سید کا اگلا قدم علی گڑھ کالج کا قیام تھا۔ اس کالج نے علی گڑھ تحریک کے لیے مضبوط مرکز کا کام کیا۔

اسی تحریک کے اساسی پہلو سید احتشام حسین کے نزدیک نئے علوم کا حصول مذہب کی علوم عقلی سے تفہیم، سماجی اصطلاح اور زبان و ادب کی ترقی تھے۔ علی گڑھ تحریک کے اثر سے معاشرے میں وہمی و تخیلی رویوں سے کنارہ کشی کرنے حقیقت کو قبول کرنے اور ترقی کی طرف قدم بڑھانے کا رجحان حاصل ہوا۔

مذہب، معاشرت، سیاست اور ادب میں ماضی کی بجائے حال اور مستقبل پر نگاہ رکھنے اور وقت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھنے کی حوصلہ افزائی ہوئی جس سے ایسی فضا تیار ہو گئی جس میں لچکدار رویوں کو فروغ ملا۔

تحریک علی گڑھ کا بنیادی رخ سیاست اور سماج کی طرف تھا اسی سے ادب پر بھی دور رس اثرات مرتب ہوئے۔اس تحریک سے وابستہ سر سید، حالی، مولانا محمد حسین آزاد اور خصوصاً ڈپٹی نذیر احمد نے نہ صرف نظم و نثر میں نئے خطوط کو وضع کیے بلکہ مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔

ادب کے افادی پہلوؤں پر زور دیا گیا اور لفظ کی سامراجیت ختم کر کے معنی کو اولیت عطا کی گئی۔ جس سے نئے افکار اور متنوع پہلو سامنے آئے جو علمی اعتبار سے علمی جواہر ریزوں سے مالا مال تھے۔

سر سید اور ان کے رفیق ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح کے جوش میں ادب کے جمالیاتی زاویوں کو نظر انداز کر کے مقصدیت کی شدت نے ادب کو تبلیغی بنا دیا۔ فکری سطح پر اس فکر کی بالیدگی مغرب زدگی کی بدولت ہوئی۔

انیسوی صدی کے آخر تک بر صغیر میں مختلف تحریکوں کی وجہ سے قدیم طرز و فکر و احساس کے ساتھ نیا سیاسی سماجی شعور پیدا ہو چکا تھا۔

جدید تعلیمی اداروں کے قیام ذرائع نقل و حمل اور رسل ورسائل کی بہتری کے فروغ نے بر صغیر اور حکومت کے درمیان افہام و تفہیم کی راہ ہموار کر دی۔ جمہوریت آزادی اور مساوات کے جدید مغربی تصورات نے لوگوں کو نئے انداز سے سوچنے اور نئے نظام میں ترقی کے اصولوں سے واقفیت دلانا شروع کی۔

سیاسی تنظیم سازی کا قیام اس سلسلے کی کڑی ہے، ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت کانگرس نے ہندو اکثریت نے اپنے مفادات کو ترجیح دینا شروع کر دی۔

اردو ہندی تنازعے نے مسلمانوں کو بحیثیت قوم اپنے آپ کو منظم کرنے کا احساس دلا دیا تھا۔ کانگرس کی مسلم مخالفانہ پالیسی نے اس احساس کو مزید گہرا کر دیا ہے اسی نئے طرز احساس کی اٹھان اور کش مکش کے نئے رویوں کے پھیلاؤ کا نقطہ آغاز ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا دور ۱۸۵۷ کا دور ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی سماجی حالات کا عکس ہمیں نذیر احمد کے شعری مجموعے نظم بے نظیر میں جا بجا ملتا ہے۔

سماج اور معاشرے میں تبدیلی، انقلاب یا تغیر ناگزیر ہے کیونکہ تغیر اور تبدیلی اور فطری عمل اور مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے۔ ہر دور میں سماج میں سیاسی اقدار اور معاشرے کی نوعیت تبدیل ہوتی رہی ہے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے رجحان، سیاسی انقلابات کی وجہ سے بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئی۔ اقتدار کی منتقلی شکست اور شکست خوردہ قوم یا حکمران وقت اقتدار کی منتقلی محروم نہیں ہوتے بلکہ محکوم قوم اپنے تہذیبی ورثہ فکری اہمیت لسانی اور معاشرتی طرز زندگی سے بھی محروم ہو جاتی ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہو کر غلامانہ زیست اپنانے پر مجبور و مایوس ہو کر زندگی گزارتی ہیں۔

۱۸۵۷ غدر کی وجہ سے حاکم قوم محکوم بن گئی تو ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے میں خاص طور سے مسلم سماج میں مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے جس عہد میں زندگی بسر کی اس کا تاریخی و سماجی پس منظر ان کے شعری مجموعے نظم بے نظیر میں سماجیاتی نقطہ نظر کے حوالے سے جا بجا ملتا ہے

ہندوستان پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ انہوں نے اپنی ذہانت، علم و فن اور حکمرانی کے ذریعے ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے میں معزز و ممتاز گردانے گئے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی معاشرے کو اسے اعمال افکار اور انسانی جذبہ سے معمور کیا۔ قدیم ہندوستانی معاشرے کی برائیوں کو جیسے ذات پات، چھوٹ چھات، دختر کشی اور ستی کی رسم جیسے غیر مہذب طریقوں کو بند کرنے کی سعی کیں، ایک زمانے تک مسلمان حکمرانوں نے اور ان کے امراء نے تمدنی کارنامے انجام دیئے۔ جب اقتدار کا نشہ بولنے لگا تو خرابیاں رونما ہوئیں

۔ یہاں تک کہ حکومت سے محرومی اور انگریزوں کی خلافت نے انھیں بالکل تباہ و برباد کر دیا اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

مسلمانوں کی زندگی میں جو نقائص پیدا ہو گئے تھے وہی ان کے زوال کا سبب بھی بنے اور اتنے عام ہو گئے کہ مسلم معاشرہ، اسلامی طرز زندگی، شریعت اور اسلامی معاشرہ نہ رہا۔ یہ خرابیاں ہندوستان کے دیگر اقوام خاص طور سے ہندو معاشرتی نوعیت کی تھیں۔ جن کے اثرات مسلمانوں پر پڑے۔

برسوں ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ہندوں کے عقائد و نظریات، رسم و رواج، توہمات اور طرز معاشرت کے زیر اثر اس قدر گھل مل گئے کہ ہندوستانی معاشرہ اسلامی خصوصیات سے کوسوں دور چلا گیا اور زندگی کے اہم شعبہ جات پر غیر اسلامی اثرات غالب آ گئے۔

انگریزوں کے دور میں ہندو قوم میں کئی نامور مصلح پیدا ہوئے جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندؤں نے اپنے معاشرے کو درست کرنے پر توجہ دی۔ مسلمانوں نے اس نوعیت کی اصطلاح پر دھیان نہیں دیا وہ زمانے کے تقاضوں سے غافل رہے اور اپنی حالت بہتر بنانے پر کوئی توجہ نہ دی۔ جس کی وجہ سے بدلے ہوئے حالات نے مسلمانوں کو معاشرتی لحاظ سے سماجی لحاظ سے بد سے بد تر بنا دیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے زمانے میں مسلم معاشرے کی جو عام حالت تھی وہ نہایت ہی پست اور طبقاتی حصوں میں تھی۔ دینی، اخلاقی اور معاشی اعتبار سے ان میں خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی لیے سر سید نے کہا تھا کہ اس ملک میں ہماری قوم کی حالت نہایت بد تر ہے۔ اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔ مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم نے اُٹھایا ہے اور جس کے تکبر و غرور سے پر ایک بھولا ہوا ہے، دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی حالت نہایت خستہ تھی یہاں تک عید اور تہوار منانے کے لیے رقم بھی نہ تھی۔ عید کے دن کا یہ حال ہے تو عام دنوں میں مسلمانوں پر کس طرح کی آفت ہو گی۔ حاکم قوم محکوم اور غلام بن چکی تھی چند کوڑیوں کے مول محنت مزدوری سے گزارہ کر رہی تھی۔ ایک دوسرے کی طرح حسرت یاس اور امید لگائے زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ ہر ایک شخص فکر معاش میں مبتلا تھا، بھیک مانگنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ جو لوگ کسی کے ہاں نوکر تھے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا اور ان کی بھی تنخواہیں وقت پر نہیں دی جاتیں تھیں۔ عام مسلمانوں کا حال بھی ٹھیک نہ تھا جو انگریزی کی خوشامد کرتے یا ان سے راہ رسم بڑھا کر اپنی جائیداد بچانے کی فکر میں رہتے ان کی خود نمائی بھی اس دور کا سب سے بڑا المیہ تھی۔

لوگ نام کی خاطر مذہب و قوم کی خدمت سمجھ کر جو رقم صرف کرتے وہ کھا جاتے میمن برادری کا حال بہتر تھا وہ ثواب کے لیئے لنگر خانہ کھولتے اور انھیں مسجدیں بنوانے کا شوق تھا۔ مسجد میں لنگر کھانے اور میمن برادی کے بچوں کو پڑھانے چلے جاتے۔ مسلمانوں کے امیر لوگ اپنی خود نمائی کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے۔

مسلمانوں کی ماضی پرستی نے ان کو حال اور مستقبل سے غافل بنا دیا تھا وہ اصلاح و ترقی کے لیئے کوئی کوشش نہ کرتے ان کے نزدیک تمام علوم و فنون اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کے آباء واجداد نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب مزید ترقی کی گنجائش نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں اس طرح کی سوچ، دراصل قوم کے زوال کا سبب بنتی ہے یہ بتانے کی جگہ جگہ سعی کی ہے۔ مسلمانوں میں یہ باتیں عام تھیں ان خرابیوں سے مسلمان انتہائی پستی کا شکار ہو گئے تھے اور اس کو مقدر کا لکھا سمجھ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔

قدامت پرستی نے مسلمانوں کو مزید زوال پذیر بنادیا۔ تھا۔ وہ عمدہ اور اعلیٰ اخلاقی جو مذہب اسلام کی بدولت ورثہ میں ملا تھا اس سے کوسوں دور نکل چکے تھے اور صرف اپنے اجداد کے کارناموں پر فخر کرنا ایک شیوہ بنادیا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لیئے تعلیم کو بے حد ضروری قرار دیا۔ جو لوگ تعلیم یافتہ تھے ان کی تعلیم و ترتیب اس قدر ناقص تھی کہ نہ تو وہ معاشرے کے لئے مفید بن سکتے اور نہ خود اپنی حالت درست کرنے کی صلاحیت رکھتے بلکہ ناقص معلومات کی بنا پر وہ معاشرے کے حق میں زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہے تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر مذہبی لوگوں پر مشتمل تھا اور معاشرے کی اصلاح میں ہمیشہ یہی لوگ سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے تھے۔

ب: سماجی آویزش اور نظم بے نظیر

ڈپٹی نذیر احمد کے عہد میں مسلمانوں کی سماجی حالت نہایت کسمپری کی تھی مال واسباب لٹ جانے کی وجہ سے لوگ صابر و شاکر انداز میں زندگی گزار رہے تھے ایسے مایوسی کی حالت میں سرسید احمد خان انگریزی تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی تلقین کر رہے تھے۔ کہ مسلمان سرکاری نوکری حاصل کر کے اپنی مالی حالت کو بہتر کر سکتے ہیں۔ اس سے کچھ حد تک مسلمانوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج چل پڑا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح کے لیے جو مہم شروع کی اس کا مقصد صرف مسلم قوم کی وقت کے تقاضوں کے تحت خاص ذہن سازی کرنا تھا۔ ایک ایسی قوم پیدا کرنا تھا جو عقیدت سے کہیں زیادہ عقلیت سے کام کرے، اس لیئے ادب کو بطور ترجمان محرک کے استعمال کیا۔ جو تمام ماضی کے مروجہ زاویے تبدیل کر ڈالے اور ادب کو نئے فکری دھاروں سے روشناش کرایا۔

اس سے قبل اُردو شاعری داخلیت کی ترجمان تھی جس کا دائرہ ادب برائے ادب اور عشقیہ معاملہ بندی کی حدود تک محدود تھا۔ مگر اس تحریک کے زیر سایہ جو ادب تخلیق ہوا۔ اس میں عام آدمی کی زندگی اور عمومی مسائل تھے اور ان کے حل کے لیے جدوجہد تھی۔ علی گڑھ تحریک نے مقصدی وافادی شاعری کے رجحان کو فروغ دیا اور وقت کے تقاضوں کے تحت "مسدس" جیسی شاعری تخلیق ہوئی۔ سرسید کے زیر اثر جو بھی اس عہد کے شعراء تھے اگر ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو علی گڑھ تحریک کے سیاسی مقاصد کو پورا کرتی نظر آتی ہے۔ جس میں اصلاح قوم، اتحاد تنظیم اور جدیدیت کی عقلیت کی بنیادوں پر پہلو نمایاں ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے شعری مجموعے نظم بے نظیر میں اصلاحی نکات سے قوم کے داخلی مزاج کی عکاسی و ترجمانی کی۔

عام ہندوستانی کرداروں کی عصری نفسیات اور معاشرے کی اجتماعی صورت کو نہایت مہارت کے ساتھ بیان کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی شاعری کو مقصدی اور افادی دائروں میں مقید رکھا اور عہد کے تقاضوں کے مطابق شاعری کی مدد سے اصلاح قوم کے فرائض سرانجام دیے۔ ایک محرک قوت کے طور پر فکری توانائی سے مسلم قوم میں بیداری و شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

مسلم قوم کے زوال کی وجوہات کو شاعری کا مرکز بنایا ان کا اصل مقصد اس عہد کی موجودہ نسل کو از سر نو ان کے اسلاف کے اوصاف یاد دلا کر اس مقام مرتبہ پر لے جانے کی کوشش تھی کہ جو ہماری عظمت کی علامت تھا۔

دوسرے لوگوں کی شکایت نہیں
ہم کو ہی خود اپنی رعایت نہیں

جب ہو طبعیت کو ردائے ساز
اس کے لیئے ہم ہی دوا خانہ ساز
ہم بھی کبھی با سرو سامان تھے
ہم بھی کسی وقت میں انسان تھے
اوڑھتے تھے ہم بھی کبھی سر پہ تاج
ہم نے بھی لوگوں سے لیے ہیں خراج
ملک لیئے سلطنتیں زیر کیں
خیر سے کتنی صدیاں تیر کہیں(۱)

علم و حکمت کے عروج سے مسلم قوم کا پوری دنیا میں خاص مرتبہ اور شناخت رہی ہے۔اہل یورپ کی دانش گاہیں مسلم اکابرین کے افکار سے ہی روشن ہوئیں تھیں۔ مسلم درس گاہوں میں حصول علم کی خاطر دیگر اقوام کے طلبہ آئے اور یہاں سے علمی روشنی فیض یاب ہو کر اپنے خطوں اور علاقوں کی ترجمانی اور راہنمائی کے فرائض دیتے تھے۔

ڈپٹی نذیر نے اس حوالے سے مجموعہ نظم بے نظیر میں خوبصورت انداز میں عکاسی کی ہے۔

علم میں بھی ہم کو تھی وہ دست گاہ
ہم تھے مشاہیر فضیلت پناہ
لوگ تھے شاگرد ہم استاد تھے
سارے زمانے کے شہر یاد تھے

سر میں ہمارے بھی کبھی عقل تھی

باقی ایسی اصل کی سب نقل تھی(۲)

اس کے بعد جو مسلم قوم پر زوال شروع ہوا، باہمی اختلافات نے جنم لیا۔ تفرقہ بازی نے ہوالی امت کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہونا شروع ہوئی۔ قوم رنگ و نسل، قبائل اور دیگر اسی طرح کی بنیادوں پر تقسیم کا عمل شروع ہو گیا تو باہمی اتحاد بین المسلمین جاتا رہا اور جو اکائی کی قوت تھی وہ کئی حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ آپس کی خانہ جنگی اور مذہبی و مسلکی اختلافات نے بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔

ڈپٹی نذیر احمد اس حوالے سے نظم بے نظیر میں لکھتے ہیں کہ

بات سناتے ہیں تمھیں ایک نئی

قوم کے مٹنے کے ہیں لچھن کئی

نچا مارا ہو یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو

خدا اغارت کرے اس اختلاف دین و مذہب کو(۳)

وہ تمام تر صورت وجوہات کہ جسکی وجہ سے ملت اسلامیہ کا عروج ختم ہوا اور مسلمان قوم زوال کی علامت بن کر رہ گئی اور سلطنت و ریاست ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی شاعری میں ان وجوہات کو موضوع بنایا اور مسلم نوجوان اپنے روشن ماضی اور پھر اس عظیم الشان عمارت کی تاراجی کی داستان کئی واقعیت دیلائی۔ مسلم قوم کی مکمل روایت اپنے عہد کے ہندوستانی مسلمان کے سامنے رکھتا ہے اور اس طرح ماضی سے آگاہی اور عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے اور پھر زوال کی وجوہات اور پھر حال میں ماضی کے نتائج اور اثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح مستقبل بدلنے اور قوم کی تشکیل نوع اور نظریہ قومیت کے فروغ کی کوشش کرتا ہے۔

جدھر رخ کیا سلطنت زیر فرماں

جدھر آنکھ اُٹھائی ممالک مسخر(۴)

ڈپٹی انڈیر احمد کی شاعری میں مسلم قوم کے سیاسی و سماجی حالات اور اس کی داستان رقم ہے۔ تاریخی شعور اور آگاہی ہے۔ مسلم سلاطین کی بہادری اور شجاعت کا تذکرہ ہے۔ وہ تمام اہم واقعات کو تلمیح کی صورت میں بیان کرنا جاتا ہے۔ عروج کے تمام واقعات قلم بند کرتا ہے اور پھر زوال کی وجوہات بھی سامنے لاتا ہے۔

گئے دن کہ اسلام سے کانپتے تھے

زمان و زمین بید کی طرح تھر تھر(۵)

اسلام کا وہ تابناک ماضی کے جس میں بہادر مسلم مجاہدین کی شجاعت کی وجہ سے تخت و سلطنت کا ہلنا شروع ہو جاتے تھے۔ اور لشکروں کے لشکر ایک دم سے خوف کھانے لگ جاتے تھے۔ وہ مجاہدین کہ جو تعداد میں بہت کم ہوتے انہیں صرف اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ ہوتا تھا۔ اسلامی ابتدائی عرصہ کی لشکری تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو مسلمان صرف اللہ کے نام پر اُٹھ کھڑا ہوتا، اس کے دل میں نہ تو دنیا کی محبت اور نہ موت کا کوئی خوف ہوتا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی نظم مجموعہ بے نظیر میں مسلم قوم کا مکمل تاریخی و سیاسی پس منظر ہے۔ مسلمان قوم کی ہندوستان آمد اور اسلامی لشکروں کی بہادری اور شجاعت کی داستان کہ جس سے اپنے عہد کے مسلمان کا لہو گرمانا اور پھر ایک بار سے اسے خاص مقصد کی خاطر خاص شعور کے ساتھ صف آراء کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب اسلامی لشکر ہندوستان آئے تو ان کی شجاعت بہادری اور مسلم کی رہبروں کے طرز زندگی نے ہندوستان میں مقامی آبادی کو بہت حد تک متاثر کیا۔ لاتعداد غیر مسلم نے متاثر ہو کر اسلام کی دعوت قبول کی۔ دوسرا علم اور افواج کے جلاول و دہشت کو دیکھ کر بھی ہندوستانی اقوام نے اسلام قبول کیا۔

بقول ڈپٹی نذیر احمد

بت و برہمن کی زباں پر تھا جاری
دم نعرہ ذکر اللہ اکبر(۶)

پھر آگے چل کر ڈپٹی نذیر احمد مسلم قوم کو ماضی اور حال کے آئینہ میں دیکھاتا ہے کہ ہماری نسلیں جنھوں نے راہ خدا میں کارنامے انجام دیئے اور ہر میدان میں کامرانی حاصل کی مگر جلد ہی جو زوال شروع ہے اس قوم کے اندر پہلے والی روح ختم کر کے رکھ دی ہے۔

مسلمانوں اگر تم میں ہو کچھ فکر رسا باقی
تو بول اُٹھو کہ ہو اسلام کے مٹنے میں کیا باقی
شجاعت تھی تو وہ ہم سے گئی گزری ہوئی بالکل
نہ اب وہ ملک گیری ہو نہ وہ حرب و غرہ اباقی
نہ ہمت ہو نہ حرکت ہو نہ چستی ہو نہ چالاکی
نہ خو زحمت اٹھانے کی نہ زور دست وپا باقی
خدا جانے وہ کیسی سلطنت تھی کیا تھی کیوں کر تھی
کہ تاریخی کتابوں میں ہو جس کا تذکرا باقی(۷)

ڈپٹی نذیر احمد کے نزدیک مسلم قوم کے زوال اور پسماندگی کی وجہ آپس کا اتفاق اور اتحاد کا ختم ہونا ہے۔یہی سبب ہے کہ مسلم قوم سیاسی حوالے سے دینا کی باقی اقوام سے بہت پیچھے رہ گئی جو معاشرتی وسماجی اقدار میں تبدیلیاں

رونما ہوئیں۔اوران کی وجہ سے جس قدر اسلامی معاشرہ سیاسی و سماجی حوالے سے بدلا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد وہ خاکہ کچھ اسطرح رقم کرتے ہیں۔

کہاں کی قوم کیسی خیر خواہی کسی کی ہم دردی

کہ لوگوں میں نہیں ہواب تو پاس اقربا باقی(۸)

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے جو سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور پھر سیاسی یلغار کی وجہ سے مقامی ریاستیں بہت تیزی کے ساتھ بدلتی چلی گئی۔درباری سازشوں کو ہوا ملی۔مذہبی تفرقہ بازی زیادہ تر ہوتی چلی گئی۔ مختلف اداروں کی کوششوں سے اتحادی مراکز کو تباہ و کمزور کیا گیا۔لسانی بنیادوں پر جس قدر سماج کو تقسیم کیا گیا۔ افراتفری کی فضا چلی،ہر سو معاشرہ ٹوٹ کر اکائیوں کی صورت میں تقسیم تر ہوتا چلا گیا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے شاعری کے ذریعے ان معاملات کی عکاسی کی۔اس کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ اس عہد میں تفریق شدہ پسماندہ مسلم قوم کو اس بات کا ادراک بھی نہیں تھا۔کہ ان کے ساتھ کن سیاسی مقاصد کے تحت یہ سلوک ہو رہا ہے۔شاعری کے ذریعے یہ آگاہی قوم تک پہنچانے کی سعی کی گئی ہے۔

کچھ ایسی اجنبیت ان دونوں میں آکے پھیلی ہے

نہیں گویا کہیں کسی کسی کا آشنا باقی(۹)

اسی طرح قانون کی پاسداری کو جس قدر مسمار کیا گیا اس حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کا شعر قابل تحریر ہے۔

جما رکھا ہے آزادی نے وہ سکہ کہ لوگوں میں

نہ قانون ادب نافذ نہ آئین حیا باقی

مسلمان میں مگر صرف از برائے نام کہنے کو
کہ جیسے ذات کا ہو امتیاز و تفرقہ باقی(۱۰)

اسی طرح انگریز نو آباد کاری نے ہندوستان کی دولت کو جس قدر لوٹااور دیگر یورپی ممالک میں منتقل کیااس وجہ سے مقامی آبادی میں قحط سالی، غربت وافلاس میں بہت زیادہ پھیل گیا، وہ ہندوستان کہ جو ماضی قدیم اپنی دولتوں کو آنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے میں وقف کرتا تھااب اس قدر خالی ہو گیا کہ اپنے باسیوں کی روزی روٹی بھی پوری کرنے کے قابل نہیں رہا۔ پورے معاش پر نو آباد کار قابض ہو کر رہ گئے اور مسلم قوم غربت وافلاس میں چلی گئی۔

یہ سارے کھیل ہیں دنیا میں دولت کے تمول کے
مرا بہتر ہو وہ جس کے نہیں پلٹے ٹکا باقی
ہماری قوم کو افلاس نے اس طرح گھیرا ہو
کہ فی صد ایک کچھ خوش ہو تو وہ محتاج و گدا باقی
مسلمانوں کو ایسا تنگ پکڑا ہے زمانے نے
نہ میرے رہنے کی گنجائش نہ جینے کی جگہ باقی(۱۱)

اس عہد میں ہندوستانی معاشرے میں سماجی اقدار بہت زیادہ حد تک تبدیل ہو گئیں تھیں اس سے قبل اسلامی معاشرہ اسلامی اقدار کا علمبر دار تھا۔ مگر جس قدر جدیدیت نے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور سماجی اقدار تبدیل کیں اور عورتوں کے پردہ کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں۔

کسی کے کام آئیں یا کسی کو نفع پہنچائیں
جو ہوتے آج کو ایسے نفوس اولیا باقی

تو کیوں اکثر مسلمانوں کی بول حالت دری ہوتی
کہ گھر میں سر پہ بی بی کے نہیں ثابت ردا باقی(۱۲)

اسی طرح سرسید کی مخالفت میں بہت سے لوگ آئے کہ جنہوں نے انہیں لادین قرار دیا۔اسلام سے خارج اور انگریزوں کا نمائندہ سمجھا تو ڈپٹی نذیر احمد نے اُن کے دفاع کے لیئے آواز بلند کرتے ہیں کہ

یہی اک فرد اکمل ہو کہ جس کو دیکھ کر جاتا
ہماری ناؤ کے بارے اب تک ناخدا باقی
جزاک اللہ خیراً قوم کی اصلاح حالت میں
دقیقہ ایک بھی تو نے نہیں رکھا اُٹھا باقی(۱۳)

ڈپٹی نذیر احمد قوم کی امیدیں بلند کرتے ہیں اور نئے سرے سے اتحاد کی طرف لاتے ہیں۔

اچھل آئے ڈوبے ہوئے کتنے بیڑے
سنبھل جاتے ہیں لوگ کھا کھا کے ٹھوکر(۱۴)

ڈپٹی نذیر احمد اس عہد کی موجودہ صورت سے خوش نہیں تھے مگر حالات بدلنے کی امید مسلم قوم کی ضرور تھی اور اسلام کی سربلندی کی امید بھی تھی۔

ولیکن بظاہر توقع نہیں ہے
کہ اسلام کو ہو بحالی مکرر

اگر ہو تو سمجھ کہ جی اٹھے مردے

اگر ہو تو جانو ہوئے موم پتھر(۱۵)

وہ قوم جو ہر طرح سے مایوس ہو چکی تھی اور مد مقابل ہمت طاقت ور ثابت ہو نا تھا تو ڈپٹی نذیر احمد اس حوالے سے کہتے ہیں کہ

ہوئے ہیں بہت دانہ بے حقیقت

بزور طبیعت درخت تناور(۱۶)

جملہ سامان یاس و غم کا ہے

صرف اک آسرا کرم کا ہے (۱۷)

مسلم قوم کو ایک بار پھر سے اتحاد کی طرف ڈپٹی نذیر احمد لاتے ہیں۔ متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور تمام تفرقات کو ختم کرنے اور یک جان ہو کر ایک امت واحدہ کی صورت میں دوبارہ سے حکمرانی نامور عزت کی طرف لے کر آنے کی سعی کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد مسلم قوم کو اس مرکز کی طرف سے جانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس نے آغاز میں ہی مسلم قوم کو ایک صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ جسکی وجہ سے انہیں معاشرے میں عزت ملی۔ سو حکمرانی اور وقار دیناو آخرت میں کامیابی کی کنجی ہے۔

ذرا دیکھئے کیا سے کیا ہو گئے ہم

سبب کیا؟ تم کہ باہم جدا ہو گئے ہم

سمجھتے بھی ہو کچھ کیا ہو اخوت

یہی ہے یہی سے یہی اصل قوت

وہ مکے کا گھر قبلہ مشترک ہے

بھلا ایک ہونے میں کچھ اب بھی شک ہے(۱۸)

جب مسلم قوم سے ہندوستان میں سربراہی جاتی رہی تو انگریز حکمران بن گئے۔اس سے قبل جو دو بڑی اقوام آباد تھیں ہندو اور مسلم۔انگریز حکمران نے جدیدیت کے تصور سے ہندوستان کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔جدید اور جدید طرز زندگی کی کوشش، مسلم قوم نے انگریز کو اپنا مذہبی اور ریاستی حریف سمجھا اور ہر طرح نفرت اور دشمنی رکھی گئی۔اس طرح ہندو قوم نے وقت کی نزاکت کو سمجھا اور نوجوان طبقہ جو حکمران قوم جدیدیت کے تصور سے لبریز تھی ان کی پیروی کرنے اور جدیدیت تعلیم کے حصول کے لیے محنت کی۔

اس طرح مسلمان پسماندہ سے بھی نچلے درجوں پر چلے گئے۔ہندو قوم نے جدید تعلیم کی مد میں اعلیٰ مقابلے کے امتحانات دے اور حکمرانوں میں شمار ہوتے گئے۔مگر مسلمانوں نے جدید تعلیم کو مذہبی طور پر حرام قرار دیا۔سرسید تحریک کا اصل مقصد وقت کے تقاضوں کے تحت مسلم قوم کو مناسب سیاسی حکمت عملی سے جدید طرز تعلیم کے دینے کے ساتھ ساتھ کامیابی کی طرف بظاہر ہمکنار کرنا تھا۔

اس حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں کہ

امتحانوں میں ہیں انگریزی کے جتنے کام یاب

یا کوئی پر شاد ہے یا جند ہے یا داس ہے(۱۹)

تہذیب و ثقافت میں تغیر ہو رہا تھا۔ مذاہب پر اثرات مرتب ہو رہے تھے اور شخصیات پر بھی یہ ہی آثار نمودار ہو رہے تھے۔ سر سید احمد خان جنھوں نے نئے شعور سے اس سماج کو متعارف کروایا کہ جدید علوم ہمارے ہی لیئے کسی قدر ضروری ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی اشعار میں بھی سر سید کے عقائد کی حمایت کی۔

سید کے عقائد کی تو کہتے ہیں لیکن
امت پر محمدؐ کی دل و جان سے فدا ہیں(۲۰)

جب کوئی قوم کسی علاقے پر قابض ہوتی ہے تو اس کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی غرض سے ہندوستانی سماج پر قابض ہوئے ہندوستان میں اخلاقی، سماجی رویوں میں تبدیلی جتنا انگریز لائے۔ شاید ہی کوئی اور لا سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد ان کی تعریف کرتے میں کہہ رہے ہیں کہ

تمدن میں داخل ہوئی وضع یورپ
چلن ہو چلا سکہ ملتبس کا(۲۱)

اب کھوٹا سکہ کیسے کہیں اور کہاں چلے گا، ڈپٹی نذیر احمد کی مراد یہاں پر مسلمان ہیں۔ انگریز سرکار جو کچھ چاہتی تھی وہ اس نے کر دیا۔ اب مسلمان بغیر جدت اپنائے کیسے زندگی گزاریں گے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی اکثر نظمیں محفلوں میں پیش کی گئی نظر آئیں ہیں۔ سر سید نے ان کی نظموں کو نظم بے نظیر اس لیے کہا کہ یہ اصلاحی نوعیت کی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد انگریزوں کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر گہرا طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ ماضی پر نگاہ ڈال کر حال میں مسلمانوں کی حالت پر غور کرواتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے تبدیلی کا کوئی عمل و حرکت نہیں دراصل اصلاح مطلوب ہے۔

عزیزو ! کبھی تم نے یہ بات سوچی

رہے کیوں مسلمان موچی کے موچی (۲۲)

مسلمانوں کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے اور بار بار اصلاح طلب ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کا شمار اردو ادب کے ارکان خمسہ یعنی سر سید، مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی میں ہوتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد شاعرانہ ذوق وجلال کے پیکر تھے، شعر گوئی کو ایک مقصدی وافادی سلسلہ سمجھا ان کی قومی وسیاسی نظمیں، موضوع کی جدت اور رفنی پختگی کے لحاظ سے اردو شاعری میں اضافے کی حیثیت رکھتیں ہیں۔

بحیثیت شاعر ڈپٹی نذیر احمد کا مقام، شبلی و آزاد سے فروتر ہے، لیکن قومی شاعری کے ارتقا کی مختصر سے مختصر تاریخ بھی ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے مجموعہ کلام دونظم بے نظیر کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی نظموں میں وعظ و نصیحت اور عقلی دلائل بہت ہیں لیکن خون جگر شدت کی جھلک نمایاں نہیں ہوتی تھی کہ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کی شاعری محض فرمائشی شاعری ہے۔

گرچہ ہے شعر و سخن سے مجھے کلی نفرت

اک مصیت ہے مگر طبع کی موزونیت(۲۳)

اک تقاضائے طبیعت سے دوم فرمائش

محسن الملک کا کہنا نہ مانوں کیا طاقت(۲۴)

ڈپٹی نذیر احمد قوم کے نباض تھے ان کی دوررس نگاہیں قومی انحطاط کے ظاہری اسباب وعلامات کی تہہ تک پہنچ گئیں جن کے نزدیک اصل مرض نفسیاتی ہے۔یعنی مذہب کے درست شعور کا فقدان جس کے نتیجے میں ترک دنیا

تقدیر پرستی اور دین و دنیا کی جدائی کے تصورات عام ہو گئے۔ بر صغیر کے لوگ اس ذہنی انتشار کا سبب مولویوں اور علماء کی منفی تعلیمات ہیں۔

حکومت و اقتدار کا سر چشمہ تو علم ہے جس سے تسخیر فطرت کی قوت کا منصب حاصل ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد بار بار ماضی کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں، تب بھی شاہان مغلیہ کی شان و شوکت ان کے پیش نظر نہیں ہوئی بلکہ ان کی نگاہ صرف ان اسلاف پر ہوتی ہے۔

جن کا عزم و عمل، جن کی دینداری، اور دنیاداری، اسلام کی حریت کا مظہر تھی۔ موجودہ سیاسی حالات میں ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے راہ نجات صرف یہ تھی کہ حکومت وقت یعنی کہ انگریز مفاہمت اور سازگاری پیدا کر کے اپنی ساری توجہ علوم مفیدہ کی صورت میں پروان لائیں۔ تعلیم کا مقصد کسب ہنر، ذہنی نشو و نما اور ایجاد و اختراع کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی حکومت کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں لیکن انگریزوں کی اندھی تقلید اور ذہنی غلامی کے سخت مخالف ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد مغربی علوم کو مسلمانوں کی جاکر میراث سمجھتے ہیں لیکن مغربی تمدن کو " سکہ ملتبس"، قرار دیتے ہیں۔

ان خیالات کا اظہار ڈپٹی نذیر احمد نے مختلف حصوں میں کیا ہے۔

لیکن ان کی پہلی نظم تمام ان کے پیغام کی ترجمانی کرتی ہے جو ہماری قومی شاعری کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چار بند ملاحظہ ہوں۔

مخلوق ذی شعور سے تو ہوشیار رہ
مست مستمند زندگی مستعار رہ

دنیا کا کاروبار کر اور دین دارده
امیدوار رحمت پروردگار ره
کس نے کہا ہے تجھ سے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھ
اس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ
کیا حال تھا رسول علیہ السلام کا
اصحاب کا ائمہ عالی مقام کا(۲۵)
سرکردہ ہائے امت خیر الدنام کا
سکہ بٹھا گئے جو محمدؐ کے نام کا
ان میں سے ایک بھی کبھی راہب ہوا کبھی
دنیا کو کھو کے دین کا طالب ہوا کبھی(۲۶)
دنیا نہ ہو تو دین کی رونق کہاں سے ہو
اعلائے شان کا در مطلق کہاں سے ہو
ایثارو بدل وجود محقق کہاں سے ہو
مصدر ہی جب نہیں ہے تو مشتق کہاں سے ہو
دنیا کو جب کسی نے عموماً کا برا کہا
میں اس کے منہ کو دیکھنے لگتا ہوں کیا کہا(۲۷)

یہ علم گر نہیں ہے تو فضل وکمال ہیچ
منشی، ادیب، شاعر، شیریں مقال ہیچ
داب مناظرات و جواب و سال ہیچ
تحقیق میں زاہد و ملا جلال ہیچ
ہم نے تو قیل و قال میں کی عمر رائیگاں
یورپ نے ہائے لوٹ لیا گنج شائیگاں(۲۸)

تمدن میں داخل ہوئی وضع یورپ
چلن ہو چلا سکہ ملتبس کا(۲۹)

دین و دنیا کو برتتے تھے مگر عدل کے ساتھ
دونوں پلوں کو ترازو میں تلا رکھتے تھے
کاردینا میں تھے مشغول بہ ظاہر ہمہ تن
دل مگر یاد الٰہی سے لگا رکھتے تھے
جھٹ اڑا لیتے نئی چیز اگر دیکھ پڑے
عار رکھتے نہ تھے اور ذہن رسا رکھتے تھے(۳۰)

مندرجہ بالا اشعار میں ڈپٹی نذیر احمد، علی گڑھ تحریک کے پر جوش مبلغ اور مخلص نقاد نظر آتے ہیں۔ سر سید سے ان کی عقیدت اور خلوص کا اندازہ ان کی مختلف نظموں اور خصوصاً ان کے مشہور مرثیہ سر سید سے ہوتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے قومی شاعری میں طنز و مزاح کے موثر حربوں سے بھی کام لیا ہے۔ حد یہ اردو شاعری میں حالی اور ڈپٹی نذیر احمد اولین طنز نگار شاعر ہیں۔ حالی نے اپنی متانت طبع کے باوجود، اخلاقی مضامین کی ثقالت و گرانی کو کرنے کے لیے بہ تکلف طنز و مزاح کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔

طنز نگاری کے لیئے معاشرتی شعور، ناقدانہ نگاہ، تیزی ذہن، جودت طبع اور شوخی مزاج درکا ہے ڈپٹی نذیر احمد ان تمام اوصاف کے حاصل تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اکبر کی طرح مستقل طنزیہ نظمیں نہیں لکھیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے قدامت پرستوں اور تجدد پسندوں، صاحب بہادروں اور ان کے مقلدوں، سب پر طنز کیا ہے، لیکن ان کے طنز کی تلخی اور تیزی اس وقت بے پناہ ہوتی ہے جب وہ دین فروش علما کو اپنے تیروں کا نشانہ بناتے ہیں۔

لیے جاتے ہیں ہم سب کو گھسیٹے قصر نکبت میں
اب ایسے رہ گئے ہیں مولوی اور پیشوا باقی
پڑھاتے ہیں سبق تحصیل حاصل زہد کا جب یاں
ہزاروں سے نہیں ہے ایک میں لسیر و غنا باقی(۳۱)

نہ ملا ہوں کہ مسجد ہے مرا کاسہ گدائی کا
مجھے دعوت میں جان فرض ہو اوروں کو شت ہو
بتا ہی جو نہ آئی ہے مسلمانوں پہ آ جائے
مجھے کیا چاہیے ہے میں ہوں مسجد کی امامت ہو

ارادہ ہے کہ اب اک مدرسے کا جال پھیلاؤں
کہ اس تدبیر سے چندے کے ملنے میں سہولت ہو(۳۲)

عالمہان دین کہ ازروئے حدیث معتبر
پیشوا و مقتداً و رہنما کہنے کو ہیں
سود بے سرمایہ ہے سرتا بسران کی معاش
دوسروں سے حرم اللہ الربٰو کہنے کو ہیں(۳۳)

ان نکیلے تیروں کے مقابلے میں ان کے یہاں لطیف طنز کے نمونے بھی کچھ کم نہیں بلکہ ایسے اشعار ان کی نظموں میں زیادہ ملتے ہیں جہاں طنز بر ظرافت کا عنصر غالب آگیا ہو

اسی کو ہم بری دولت بڑی حشمت سمجھتے ہیں
کہ مسجد میں ابھی ہے بوریا ٹوٹا پھٹا باقی
جما رکھا ہے آزادی نے وہ سکہ کہ لوگوں میں
نہ قانون ادب نافذ ، نہ آئین حیا باقی(۳۴)

حوالہ جات

۱۔ احمد، نذیر۔ نظم بے نظیر، مرتب: احمد، بشیر الدین، دہلی: مفید عام اسٹیم پریس، ص۲۸

۲۔ ایضاً، ص۲۸

۳۔ ایضاً، ص۸

۴۔ ایضاً، ص۲۸

۵۔ ایضاً، ص۳۷

۶۔ ایضاً، ص۳۸

۷۔ ایضاً، ص۳۴

۸۔ ایضاً، ص۳۵

۹۔ ایضاً، ص۳۵

۱۰۔ ایضاً، ص۳۵

۱۱۔ ایضاً، ص۳۵

۱۲۔ ایضاً، ص۳۵

۱۳۔ ایضاً، ص۳۶

۱۴۔ ایضاً، ص۳۷

۱۵۔ ایضاً، ص۳۷

۱۶۔ ایضاً، ص۳۷

۱۷۔ ایضاً، ص۲۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۲۲۔ ایضاً، ص

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۳۰۔ ایضاً، ص ۹۷

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۴۴

۳۳۔ ایضاً، ص ۹۰

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۵

باب سوم

شعری مجموعے نظم بے نظیر میں تہذیبی و اخلاقی اقدار

(الف) عہد مغلیہ کی معاصر تہذیبی صورت حال

(ب) نظم بے نظیر میں بیان کردہ اخلاقی اقدار، فکری رویے

ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کے اہم کارنامے تھے، جن کی بدولت انہوں نے وسیع و عریض حکمرانی کی، برصغیر کو اپنی فکری و فنی صلاحیتوں سے بہت کچھ عطا کیا۔

فنون لطیفہ کی جملہ اقسام، تعمیرات و نقاشی اور سنگ تراشی و آرٹ کے علاوہ برصغیر کو ان کی سب سے بڑی دین یہاں کی تہذیب و تمدن اور کلچر تھی۔ مغلوں نے یہاں کی تہذیبی و اخلاقی اقدار، معاشرتی وراثت کو مضبوط اور قوی تر کر رکھا تھا جو دوسری تہذیبوں اور قوموں کے لیے مثال تھی۔

ہر ایک قوم اور تہذیب میں نشیب و فراز کا آنا ہر ایک فطری و قدرتی عمل ہے۔ ہر وجودی شان و شوکت ایک دن اپنی بھرپور طاقت و قوت کا جلوہ دکھا کر بتدریج تنزلی کی طرف رخ کر لیتی ہے۔ یہی صورت حال وسطی ہندوستان کے آخری مرحلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر سیاسی طور پر ہی قبضہ نہیں کیا بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک متعین نظام فکر اور تہذیبی قدروں اور اخلاقی اقدار کا ایک مکمل ضابطہ بھی لائے۔

انگریزوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس نظام فکر اور تہذیبی قدروں کو یہاں ایک دم مسلط کر دیتے، اس لیے انہوں نے اپنی حکمت عملی سے ہندوستان میں مغربی تہذیب کی ایک بگڑی ہوئی شکل کو اس طرح رائج کیا کہ ہندوستان میں بسنے والی دونوں بڑی قومیں اندرونی تضادات کا شکار ہو کر اپنی بقیہ صلاحتیں اور قومی کردار کا بچا کچھا رنگ جو انگریزوں کے اقدار کے لیے کسی وقت بھی انگریزوں نے ہندوستان پر سیاسی حیثیت سے اپنے قدم جماتے ہی فکری اور سماجی سطح پر پوری مستعدی کے ساتھ اس مہم کا آغاز کر دیا۔

انھیں سب وجوہات کے بناپر بہت ساری سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔

سیاسی تحریکوں نے ہندوستان کی آزادی میں اہم رول ادا کیا، جب کہ مذہبی و سماجی تحریکوں نے مشرقی تہذیب کے تحفظ کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھیں تحریکوں کے پیش نظر ڈپٹی نذیر احمد تھے جنہوں نے تہذیبی اور اخلاقی اقدار بچانے کے لیے اپنے نظریات کو اپنی تحریروں میں پیش کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اپنی صدیوں سالہ مشرقی تہذیب و اخلاقی اقدار سے انسیت تھی اس لیے انھیں تعلیمی بیداری اور سماج کے اندر اصلاحی اور اخلاقی پہلو مقدم تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں جابجا۔ مشرقی و مغربی تہذیبوں کے تصادم کی کش مکش کو پیش کیا۔

معاصر برصغیر کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کی تہذیب و اخلاقی اقدار کا ترجمان ڈپٹی نذیر احمد ہیں یہ اپنی تحریروں کے ذریعے سے کھوئی ہوئی تہذیب واپس لانا چاہتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے اخلاقی اقدار میں وفاشعاری، فرد شناسی، احساس ذمہ داری، انسانی طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن کو سنوارنے کی علامتیں ملتی ہیں۔

نظم بے نظیر میں انسانوں کو اجتماعی انفرادی زندگی میں اچھے اور برے اوصاف میں تمیز کرنے کا جذبہ کار فرماں نظر آتا ہے۔ اور بار بار اخلاقی اقدار میں اس فکر پر زور دیا گیا ہے کہ وہ معاشرہ مستحکم رہتا ہے جس کے اندر تہذیب ہو، نظم وضبط، تعاون اور امداد باہمی کے ساتھ ساتھ خیر خواہی کا جذبہ بھی ہو۔

ڈپٹی نذیر احمد کا دور سماجی و تہذیبی اخلاقی اقدار کے اعتبار سے روبہ زوال عہد تھا۔ ایک تہذیب کی جگہ دوسری تہذیب اپنی جگہ بنانے کے لیے بے چین تھی۔ دنیا کے اندر نئے نئے علوم و فنون پیدا ہو رہے تھے جس کو حاصل کر کے مغربی قومیں ترقی کی منازل طے کرتی جا رہی تھیں۔

اس ملک کی قومیں خصوصاً مسلم قوم اپنا مذہبی تخصص بچانے میں لگی ہوئی تھی۔ انگریزی تعلیم ان کے لیے مردم تھی۔ مسلم گھرانوں میں عورتوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔

ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا اور نہ ہی ایسے ادارے موجود تھے جو ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی اقدار کی اصلاح کر سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے نظم بے نظیر کے ذریعے سماج کے متفرق جزوی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے اور معاشرے کی توجہ ان کی طرف مبذول کروائی تاکہ اصلاح اور اخلاقی اقدار معاشرے کی ترقی کے لیے ایک خوش آئند قدم بن سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مجموعے نظم بے نظیر میں نظمیں اصلاحی اور مقصدی ہیں انہوں نے اپنی فہم و فراست کے مطابق نظموں کو ایک مخصوص سمت دی اور انھوں نے جس زاویے کا تعین کیا وہ وقت کی ضرورت تھی اسی طرح ان کی نظم نگاری بھی خاص آہنگ لیے ہوئے ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نظم بے نظیر میں مقامی تہذیب و معاشرت کی ابتری کا حل نو آبادیاتی تصور اخلاق کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور ان تصورات و افکار کا پرچار کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں، جن کی وجہ سے ان کی شاعری اصلاحی مقاصد سے بوجھل نظر آتی ہے۔ وہ ہر سطح پر قوم کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ جائزہ ضروری ہے کہ وہ آخر کار نو آبادیاتی تہذیب اور تصور اخلاق کے کوئی سے عناصر سے مقامی تہذیب کو بدلنا چاہتے ہیں۔

ان تمام امور پر روشنی ڈالنے سے ضروری ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کی فکر کے پیچھے محرکات کا بھی سراغ لگایا جائے ۔اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد سر سید احمد خان سے حد درجہ متاثر تھے۔ حتیٰ کہ سر سید نے جب نذیر کی نظموں کو سنا تو خود اپنے ذاتی خرچ پر چھپوایا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی فکر فرسائی، سیاسی و سماجی شعور، بدلتے ہوئے طرز احساس، اخلاقی، مذہبی، ایسٹ انڈیا کمپنی انگریز راج میں مسلمانوں کی حالت زار، مسلمانوں میں فکری جمود، ماضی پرستی، بدحالی و تعلیم سے بے گانگی ایسے موضوعات تھے، جنہوں نے سرسید کو براہ راست متاثر کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تر نظموں کا بغور نظر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں کئی مقام پر سرسید کا ذکر ملتا ہے۔ سرسید احمد خان ایک سماجی و سیاسی شخصیت تھے۔ نذیر کی نظموں میں ان کا ذکر جس عقیدت سے ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں شخصیت میں تعلق گویا ہم خیالی کا تھا۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نذیر نے سرسید کی فکر کو اپنے تئیں آگے بڑھایا۔

سرسید انیسویں صدی کی ایک متحرک شخصیت تھے، وہ ایک ہندوستانی مسلم نظریہ عملیت کے زبردست حامی تھے۔ اس کے علاوہ وہ شاندار مصلح اور فلسفی تھے۔ تقسیم، سماج اور سیاست میں بھی ان کی خدمات غیر معمولی نہ تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب انگریز حکومت نے نو آبادیاتی نظام کے تسلط سے ہندوستان کو مکمل طور پر اپنے حصار میں لینا چاہا تو ہندوستان سماجی سطح پر اپنا توازن کھو بیٹھا۔ ہندو مسلم فسادات کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے خلاف بغاوت بھی لوگوں کے ارادوں کا حصہ بن گئی۔ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں کلی طور پر اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ اب یہ کمپنی براہ راست ہندوستانی سماج اور سیاست پر اثر انداز ہو رہی تھی اور مسلمان قوم فی نفسہ اس بات کی متحمل نہیں تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ سکے۔

اور ہندوستان میں جو مسلمانوں کی مغلیہ بادشاہت کے حوالے سے جو حکومت تھی وہ اب برائے نام رہ گئی تھی ۔ بادشاہ اپنے اختیار کھو چکا تھا، ہندو قوم اپنی چالاکیوں اور نیا پن کی وجہ سے انگریزوں کی آلہ کار بن چکی تھی۔ اس

صورت حال میں مسلمانوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں بچی تھی۔ مسلمان قوم اب انگریزی اصطلاح Limping Parw کے مترادف تھی۔

اس صورت حال میں سرسید احمد خان ایک ایسی شخصیت تھے جو بیک وقت انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کرنے میں مصروف تھے۔ایک طرف بغاوت کے اسباب بیان کر رہے تھے تو دوسری طرف قوم کی اخلاقی اور مذہبی سطح پر بھی اصلاح کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو وہ ہر صورت جدید تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے اور روایتی جمود زدہ فکر کو ختم کر کے قوم کو عقلی یا روشن خیال بناناچاہتے تھے۔

تعلیمی میدان جو اب تک مسلمانوں کے لیے گویا حرام ہو چکے تھے سرسید نے از سر نو تعلیمی میدان کو آباد کیا اور احیاعلوم کے لیے کئی اہم اقدامات کئے۔ شروعات میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں (بالخصوص مسلم نوجوان) کو سیاست سے دُور رکھا۔ در حقیقت وہ مسلم نوجوانوں کو علمی سطح پر مضبوط دیکھنا چاہتے تاکہ وہ بعد میں معاشرے کے لیے اہم رول ادا کر سکیں۔

سرسید کے ان اقدامات میں چند اہم شخصیات تھیں جو سرسید کے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھیں ان میں مولانا الطاف حسین حالی، مولوی نے ذکااللہ چراغ علی نواب محسن الملک اور ڈپٹی نذیر احمد قابل ذکر ہیں۔

اس عمل میں سب سے زیادہ جو چیز رکاوٹ بنی وہ مسلمانوں کے عقائد تھے اور اس پر فکری جمود کہ وہ کسی طور پر ان میں تبدیلی نہیں کرنا چاہتے تھے جب سرسید نے مذہب کی تفسیر عقلی سطح یا پھر سائنسی انداز میں کرنا چاہی تو ان کے خلاف ایک محاذ کھڑا ہو گیا۔ سرسید نے اپنے اس مزن کے لیے 'کلامی مکتب فکر'' کی بنیاد رکھی۔

لوگوں نے اس مکتب کی فکر کو صریحاً مذہب مخالف کہا، جو کہ متزلہ کی فکر کے برعکس تھی یا معتزلہ کے وہ افکار جو پہلے ہی متنازعہ تھے اس مکتب کی فکر نے اس کی توثیق کر دی۔

ڈپٹی نذیر احمد بھی اسی قبیل کا حصہ تھے۔ اولاً تو انھوں نے مسلمانوں کی حالت زار پر نوحہ پڑھا مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس زبوں حالی کے پیچھے اصل حقائق کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کی۔ اور مسائل کے حل کے لیے کچھ تجاویز بھی پیش کیں۔

نظم بے نظیر کا انداز حالی کی مسدس حالی جیسا ہے۔ "مسدس حالی" بھی مسلمانوں کے عظیم الشان ماضی کی باوقار داستان ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے حال کا جگر خراش نوحہ بھی ہے۔

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر
نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پرواہ
نہ عقبی میں دوزخ نہ جنت کی پروہ(۱)

اسی سے ملتا جلتا مضمون ہمیں نذیر احمد کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

شجاعت تھی تو وہ ہم سے گئی گزری ہوئی بالکل
نہ اب وہ ملک گیری ہے نہ وہ حرب و عزا باقی
نہ ہمت ہے نہ جرات ہے نہ چستی نہ چالاکی
نہ خو زحمت اٹھانے کی نہ زور دست وبا باقی(۲)

مسلمانوں کی زبوں حالی کی ایک اہم وجہ مسلمانوں کا ماضی پرستی تھا وہ ہمیشہ ماضی میں جیتے آئے اور اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر بغلیں بجاتے آئے۔ جس طرح اقبال نے کہا تھا

تجھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو(۳)

ڈپٹی نذیر احمد کو مسلمانوں کے ماضی پرستی کا شدت سے خیال تھا۔ وہ ان کو اس عفریت سے نکال کر حال سے پیوستہ کرنا چاہتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے نزدیک مسلمان اب اس بات کے متحمل ہیں کہ وہ اپنے نقصانات پر بین کرتے رہیں اور اس بات کو نصیب کا لکھا مان کر صاحب فراش ہو جائیں۔ وہ ان کو اس جمود سے نکال کر متحرک دیکھنا چاہتے۔ اپنی نظم میں لکھتے ہیں کہ:

عزیزو! کبھی تم نے یہ بات سوچی
ہے کیوں مسلمان موچی کے موچی (۴)

کون سی ایسی قیامت تھی جو مسلمانوں پر نہ ٹوٹی تھی۔ کہتے ہیں جو قومیں برق رفتار قوموں کا ساتھ نہیں دیتی وہ کچلی جاتی ہیں۔ مگر کوئی بھی قیامت ہو، مسلمانوں کا جمود نہ ٹوٹ سکا، اسی کی سب سے اہم وجہ مذہبی تھی۔ مسلمان قدیم عقائد اور رسوم رواج میں ٹھہڑی قوم تھے۔ وہ اپنے عقائد کے برعکس کسی بھی عمل کو غیر مذہبی قرار دیتے تھے۔ اس لیے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ جو عقائد مسلمانوں نے اختیار کرر کھے یا جن کی تفسیر بعد ازاں سرسید سائنسی بنیادوں پر کرتے رہے وہ اصل میں اپنی منطق کے اعتبار سے بے لچک اور جمود زدہ تھے۔ کسی نئی فکر، نظام یا تصور کا ان میں دخول صریحاً ناممکن تھا، اور اس طرح یہ قدامت زدہ مکمل نظام، اپنے اصل ماخذات سے آزاد ہو کر ایک خود کار فکر بن چکا تھا۔

کوئی بھی نظام ہو یا پھر نئی فکر اس عقیدے کے کسی نہ کسی کلیے سے ٹکرا جاتی، اس فکر میں قرون اولی والی غائرت بھی نہیں بچی تھی۔ اتنا ہی نہیں اسلام کے کئی نامور مبلغ کوپر نیکس اور گلیکو کے نظام کو بھی اسلامی عقائد کے خلاف جنگ قرار دینے لگے تھے۔ اور ستاروں کے اسی قدیمی تصور پر عمل پیرا تھے۔ جو ایک مدت تک ایک طرح کی سائنسی حیثیت رکھتا تھا۔

ان تصورات کے راسخ ہونے کی چند اہم وجوہات تھیں۔ سب سے پہلے تو نظام تعلم جو مروجہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے استعمار سے پہلے جو نظام تعلیم رائج تھا۔ وہ انسان کی ذہن سازی کچھ اس طرح کرتا تھا کہ وہ محض کسی مخصوص نظام کے تابع ہو کر رہ جاتے۔ اور اس نظام کی بنیاد عام طور پر حکم واطاعت پر ہوتی اور اس کے آگے کچھ نہیں۔

یہ نظام چھوٹے درجے سے لے کر اعلیٰ سطح تک تقریباً ایک جیسا تھا۔ ذہنوں میں کسی بھی طرح کی فکری تحریک پیدا کرنا ان کے اہداف میں شامل نہیں تھا۔ لہٰذا بنیادی طور پر جو آزادی ایک آزاد انسان کو حاصل ہونی چاہیے تھی اس کے خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکے۔ اس جمود نے انسان کی معاشی و معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جس سے اس دور کے انسان نے پیداوار کے نئے زاویوں سے بھی انحراف کیا اور معاشرتی سطح پر جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے کہا، موچی کے موچی رہے۔

نذیر احمد کے نزدیک ہر چند کہ برصغیر میں مسلمانوں کی سلطنت کا اختتام جگر خراش تھا مگر یہ صرف عوام کی سادہ لوحی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ اس زوال میں اوپر سے نیچے تقریباً ہر طرح کے عوامل ذمہ دار تھے۔ ہمارا جو حکمران طبقہ تھا انھوں نے مذہب کا استعمال کر کے لوگوں کو جاہل رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی بری عادات میں جکڑ لیا۔ ہمارے حکمرانوں نے جس ستی اور تساہل سے حکومتی نظام کو چلانا چاہا۔ اس کے نتائج اسی وقت سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہمارے بادشاہوں اور کاسہ سیب و حاشیہ بردار امراء کی عیاشیاں تاریخ میں اب کسی طور مستور نہیں۔

بالخصوص مغلیہ دور میں بادشاہوں کے کچھ کردار ایسے بھی ملتے ہیں جو فی نفسہ گندی آدمیت تھے۔ جنکی لکاریاں اور ریاکاریاں حکومت کے اس مج تک لے آئی تھیں۔ایسٹ انڈیا کمپنیEast India Company کو ملکی باگ دوڑ نے کس نے دی تھی؟آخر محمد شاہ رنگیلا کوئی تھا؟جس کی عیاش طبیعت نے ہندوستان کی سادہ رغبت کو ایک وقت ڈال دیا تھا۔کیا اس نے ہندوستان میں مسلمانوں اور حکومت کی ساکھ کو کمزور نہیں کیا تھا؟

جب حکومتی نظام مکمل طور پر مفلوج زدہ ہو کر رہ گیا تو ان حکمرانوں نے غریب رعایا کی جیبیں کاٹنا شروع کر دیں ان کی بساط سے باہر ٹیکس لگانا شروع کر دیے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ استعمار نے ان پر قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ اس سادہ عوام کو داخلی استعماریت سے نکالا تھا۔وہ استعمار جس کو ظلم و جبر کا دور کہا گیا۔سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں اگر انصاف کا بول بالا ہوا یا ہندوستان نے کوئی ترقی کی تو وہ اسی دور کی دین تھی۔ ملکی سطح پر عدالتی نظام کو رواج سید۔اس میں کوئی جنگل کا قانون نہیں تھا کہ کوئی بھی سیاہ بخت ایک کھلے سانڈ کی طرح جنگل کو برباد کرتا پھرے۔اس میں اگر کسی کو زیادہ تکلیف ہوئی تو وہ طبقہ جو تساہل پسند تھا اور اپنی عیاشی سے بھرپور زندگی گزار رہا تھا جو کہ اب نہیں رہا تھا،اس پر شور کرنے لگا اور اس نظام کو مسلط بد ترین نظام کہنے لگا۔اور عوام نے بھی اسی روانی انداز میں ان کی آواز پر لبیک کہا۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد پوچھتے ہیں کہ خدارا خود لگتی اور بتایئے کہ قصور کس کا ہے؟؟اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانے میں کہ کیا ایسے میں مسلمان خود خراب نہیں تھے کہ وہ حقیقت کو جان کر بھی کچھ بدلنے کو تیار نہیں تھے۔ پھر اگر وہ آہ زاری کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں۔ در حقیقت یہ ان کی سماجی حالت بدلنے کی پہلی سیڑھی تھی۔ مگر مسلمانوں کو اس بات کا احساس نہیں تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ :

زوال سلطنت تھا گو بظاہر موت سے بدتر
ولیکن درحقیقت قہر میں بھی رحم تھا مضمر
کہ ہم کو امن و آسایش ہے اپنے عہد سے بڑھ کر
ہوا ہے علم ارزان جے بھٹے مولی اور گاجر
یہ آزادی جو حاصل ہے کسی کو کب میسر تھی
اگر سچ پوچھئے تو زندگی لوگوں پہ دوبر تھی(۵)

اس عمل مسلمانوں کی جمود زدہ فکر اور عمل کو ڈپٹی نذیر احمد تنقید کا نشانہ بناتے ہیں مسلمان جن اسلاف کے ایما پر بغلیں بجاتے نہیں تھکتے، ڈپٹی نذیر احمد لپٹیں نظر آئینہ ان کو دکھاتے ہیں۔ اور اس دور کو پروان نہیں بلکہ تاریخ زمانہ بناتے ہیں۔

مسلمانوں نے ہر دور میں اجتہاد پر ہونے والی قتوں کو شرعی فتویٰ سمجھا اور ٹرک کی بتی کے پیچھے لگ گئے۔ مولوی نذیر احمد اس دور کو اجتہاد نہیں بلکہ سیاسی حکمرانی کی ذاتی ضرورتوں کا نام دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے زوال کی تین بڑی وجوہات تھیں جو مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں۔ ایک معاشی مسلمانوں کے علاقے جہاں پر ترقی یافتہ اور طاقت ور استعماروں کے لیے سہولت کار وسائل موجود تھے، استعمار نے ان پر ایک الگ انداز میں قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ جمہوریت کی بجائے انفرادی سطح پر معاملہ سر انجام دینے کے بجائے عادی تھے۔ اس لیے غیر جمہوری معاملات میں اسباب کی وجہ صرف خارجیت نہیں تھی بلکہ داخلیت بھی حد درجہ ذمہ دار تھی۔ اس لیے ایسی کوئی بھی روایت قائم نہ ہو سکی جو کسی طرح بھی سود مند ہو۔ مابعد نو آبادیاتی نظام از سر نو ایک طرح

کااستعماری نظام تھا۔ جو انفرادیت واجتماعیت کے ڈسکورس سے آگے مذہبی اور معاشرتی تھی۔ ہر چیز کو قوم اور مذہب کی بنیاد پر پرکھا جانے لگا۔

یہ نظام کسی طور پر سود مند نہیں تھا۔ بلکہ افراتفری پر مبنی نظام تھا۔ یہ وہیں تھا جو استعمار دور سے پہلے تھا۔ ہاں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مسلمان کسی اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی بات کرتے ہیں کہ جن کی حقیقت کسی سراس سے زیادہ نہیں۔

"برائے نام انگریزوں کو کہنے کو رعیت ہیں۔ کہ حاکم رحم دل منصف مزاج یہ نیک نیت ہیں۔ لیاقت ۔۔۔ ہیں جو ہر شناس قابلیت ہیں اور اس پر بھی نہ پنپے ہم تو پورے بے حمیت ہیں"(٦)

مسلم دنیا میں شدت پسندی کی وجہ سے چہار سو جہالت کا ہی دور دور رہا اور یہ جہالت عوام میں نہیں تھی بلکہ حکمران اور حکمران طبقے سے جڑے کاسہ علما میں تھی۔ جو اپنے قدیمی عقائد پر اس طرح مصر تھے اس کے خلاف کسی بھی عمل کو خلاف شریعت کہہ دیتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلامی احکامات کو زمانی اعتبار سے نادیکھا کہ موجودہ دران پرانے تصورات وافکار کا متحمل نہیں ہے۔ الگ ہے تو پھر کس طرح نہیں یا پھر اس میں کن تبدیلیوں کی اشد ضرورت ہے تاکہ نظام کو اس قدر لچک دار بنایا جایا کہ وہ جدید دور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔ مگر شومی قسمت ایسی فکر کسی کے پاس نہیں تھی۔

اور وہ یہ طبقہ تھا کہ ان سے ٹکرانے والی ہر فکر اسلام دشمن شمار ہوتی تھی۔ جس میں اسلام اللہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اور اس دور میں اسلام کے لیے یہ تاثر سامنے آئے کہ گویا اسلام دنیاوی اعمال کو اس حد تک قبول کرتا ہے کہ

اس میں نیک نیتی ہونی چاہیے، اور جس چیز کو اجتماعی سطح پر نیکی مان لیا جاتا یا نیک اعمال تصور کیا جاتا تو وہ اس کو فوراً غیر مقدس قرار دیتا ہے۔

جب اجتماعی سطح پر آپ کسی فلاح کے تیار نہ ہوں اور ہر نئی فکر کو آپ رد کریں تو آپ سماج کو کیا فراہم کر رہے ہیں۔ جن حکام بالا سادہ عوام کو اندھیرے میں رکھ کر امن قائم کرے تو وہ اندھرانی تضیہ تاریک دور ہے، جس میں شخصی آزادی اور ناانصافی کا چلن ہوتا ہے۔

ہندوستان میں نئے استعماراتی نظام نے ایک ترقی یافتہ قوم کی طرح ہندوستانی معاشرے کو بدلنا چاہا، ہر چند کہ اس سب کے پیچھے ان کے مخصوص سیاسی اقدامات ہو سکتے ہیں مگر ان لوگوں نے ہندوستانی عوام کو تعلیم، شعور اور ترقی کی عملی صورت ضرور دکھائی۔

ڈپٹی نذیر احمد بھی ایسے ہی معاشرے کا حصہ تھے انھوں نے استعماراتی قوم سے پہلے حالات کو بھی دیکھا تھا اور نوآبادیاتی قوم کے وقت کا ہندوستان بھی دیکھا تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے ہندو مسلم معاشرے میں کوئی بقا نہیں اس لیے مسلمانوں نے اگر خود مختار حیثیت بنانی ہے تو ان کو بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کے پاس کو راہ نہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد مسلمان طبقے کے ان علماء حکماء سے ناراض نظر آتے ہیں جو لوگوں کو دین کی غلط تشریحات پیش کر رہے تھے اور سادہ لوح عوام کو بدگمان کر رہے تھے ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

مگر کیا ظلم ہے ہم بدگمان ہیں اس قدر ان سے
کہ ہر ایک بات میں رکھتے ہیں پرہیز اور حذر ان سے
الٰہی کب وہ دن ہوگا کہ ہوں شیر و شکر ان سے
تو پھر جی کھول کر حاصل کریں علم و ہنر ان سے

بطوع و خوش دلی ایک ایک کی عادت کوسہ جائے
یوں ہی کچھ تفرقہ مذہب کا رہ جائے تو رہ جائے(۷)

مغلیہ سلطنت کے (Downfall) کے بعد تقریباً ۲۵۰ سال تک انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کی۔ لیکن اس دورانیے میں انگریز استعمار کاروں نے کوئی بھاری بھر کم نفری ہندوستان میں وارد نہیں کی۔ ان کی فوج کی تعداد 50ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اور ان کے مقابلے میں کئی بڑے لشکر پنجہ آزمائی کے لیے نکلے مگر کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکے، وہ مسلمان جنگ جو تلوار، بھالے لے کر عرب سے برصغیر میں آئے تھے، انہیں استعمار کاروں کی توپوں اور بندوقوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ ایک ایمان کی کمزوری یا وسائل وصلاحیتوں کا فقدان اس کی وجہ تھی کہ استعمار کاروں کے پاس جدید تر اسلحہ اور جدید ترین مواصلاتی نظام موجود تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے پاس جدید طرز کی حکمت عملیاں بھی موجود تھی۔ ان تمام چیزوں نے ان استعمار کاروں کی مدد کی اور وہ ایک نو آبادیات اور طاقتور قوم کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور قابض ہو گئے۔ اور پھر نتیجہ یہ نکلا کہ جو حکمران تھے وہ غلام ٹھہرے اور جو باہر سے آئے ہوئے تھے وہ حکمران بنے۔ تو اس صورت حال میں مسلمان ان استعمار کاروں کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

برصغیر کے مسلمان نہ تو ہنر مند تھے اور نا ہی معاشی سطح پر اس قدر طاقتور کے وہ کوئی سماجی حیثیت قائم رکھ پاتے۔ اس کے ساتھ مذہبی عقائد اور تہذیبی تصادم نے ان کو ترقی کی راہ سے اور دور کر دیا۔

ڈپٹی نذیر احمد مسلمانوں کو یہ احساس میں دلانے میں مصروف نظر آتے ہیں کہ آخر ایک بے ہنر قوم ایک ہنر مند قوم کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ اور اگر وہ کسی طور پر اپنے زور بازو پر یقین کر کے قسمت بھی آزمانا چاہیں تو استعماری گولہ بارود کے سامنے کیسے ٹک پائیں گے۔

مسلمانوں کے پاس کل ملا کر بس اتنا ہی ہو سکتا تھا کہ وہ خود کو جدید بنائیں، اپنے پرانے اور متر ودہ خیالات کی بیخ کنی کریں اور خود کر بڑا بنائیں تا کہ وہ ہر سطح پر استعمار کاروں کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر صورتحال مسلمانوں کی کیا تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد یوں بیان کرتے ہیں:

کوئی یا کوئی بات ہو اس میں دیں گے آڑنگے
کوئی کام ہو اس میں مذہب کی بنجر
یہ دنیا میں رہنے کے لچھن نہیں ہیں
اٹھاؤ چلو نہ کرو اپنا بستر (۸)

ڈپٹی نذیر احمد سے پہلے ایک جاندار انسان اور بھی تھا جو مسلمانوں کی جمود زدہ فکر کو آڑے ہاتھوں لے رہا تھا۔ مسلمان تہذیبی سطح پر جس تصادم کا شکار تھے۔ سرسید کے نزدیک اس میں بقا کسی طور نہیں تھا۔ نظم ہے نظیر کو جیسا کہ سرسید نے ہی اشاعت کروائی۔ اس نظم میں سرسید کو اپنے خیالات کو پڑھانے اور اس کے بااثر اظہار کے لیے ایک وسیلہ نظر آیا تھا۔ اجمالی طور پر سرسید کے تہذیبی واخلاقی تصورات کو بحث کا حصہ بناتے ہیں تا کہ ہم اس میں سے ڈپٹی نذیر احمد کے ان خیالات کو سامنے لا سکیں جو مماثلت رکھتے ہیں۔

سرسید پر مسلمانوں کا یہ اعتراض تھا کہ وہ ہر شخص کو عقلیت پرست بنانا چاہتے ہیں اور ہر ایک شہری کو روشن دماغ دینا چاہتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کی تہذیب مذہب، آراستہ ہے، جس کی بنیاد مذہب پر ہے اور ایمان ہی اس کی اساس ہے اور ایمان کی تشریحات و تعبیرات عقلی سطح پر نہی ہو سکتیں۔

بہر کیف اسلامی تاریخ معقولات و مقولات کی بحث بہت قدیمی ہے۔ اس کا آغاز تقریباً اسلام کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ ان دو تصورات کی مبادیات "جبر اور قدر" کے مسئلے سے ہوئی۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان کے

بس میں کچھ بھی نہیں حتیٰ کہ اس کی قسمت بھی گویا وہ قسمت کا غلام ہے، اور قسمت جہاں چاہیے اسے لے جاتی۔ یہ گروہ ''جبری'' گروہ کہلوایا۔

جب کہ دوسری طرف 'قدری' گروہ تھاان کو موقف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے لیے اس کائنات کو مسخر کر دیا کہ انسان کے پاس اختیار ہے کہ وہ اپنا نصیب خود لکھ سکے۔ اور خدا تعالیٰ نے انسان کے لیے خاطر خواہ انتظام کر رکھا ہے۔ اب اس کی مرضی کے اس نے اپنی زندگی کو کس طرح گزارنا ہے یا بنانا ہے۔ اس بحث نے مسلمانوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیا۔

معتزلہ کا یہ دعوی تھا کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں جس کو عقلی سطح پر نہ پرکھا جا سکے۔ ان کے نزدیک علم و دانش کے لیے فقط الہام وحی ہی نہیں بلکہ مشاہدات اور تعقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور انہوں نے عقلی بنیادوں پر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی بھی کوشش کی۔ اور اس عمل میں انھوں نے احادیث و روایات کو سندی و غیر سندی تقسیم میں بانٹنا شروع کر دیا۔ اس عمل نے مسلمانوں کو گروہوں میں بانٹنا شروع کیا۔ مگر راسخ العقاعد طبقہ نے اس تقسیم یا فکر کو خلاف ایمان نہ سمجھا اور اسی کی طرف دھیان نہ دینے کو اپنے ایمان کی طاقت سمجھا، اور ایمان کی مضبوطی کے لیے نت نئے فتاوی جاری کرنے لگے اور سماج کو عملی طور پر کچھ اچھا سمجھا تو صرف اور صرف عبادت و ریاضت کی حد تک۔ بارِ دیگر ہر عمل کو دنیاوی قرار دیا۔ اور کسی بھی کامیابی کو عارضی اور غیر ضروری کہا۔

سر سید نے اپنے دین کی تشریح عقلی سطح پر کرنی چاہیے، اور دین اسلام کو مر لبر فطری دلیل کہا۔ جس پر مخالفین نے انھیں ۔۔۔ کہنا شروع کر دیا۔ سر سید مسلمانوں کے اس محدود ذہنیت، پرانی روایات، اور دیتانوسی خیالات کو رد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب ان کو اپنے اس عمل میں انگریز دور میں آسانی نظر آئی تو وہ سماجی سطح پر اس پر کام کرنا شروع ہو گئے۔ اکثر لوگوں نے ان انگریز یا استعمار کاروں کا نمائندہ کہا تو کسی نے ملحد۔ سر سید کے تمام تر نظریات تقریباً

مقرضہ ہی ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد نے بر صغیر کے مسلمانوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ سرسید کے تمام تر اقدامات صداقت پر مبنی ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی فلاح کے لیے ہر کوشش کی مگر حیف، کے مسلمانوں نے انھیں اپنا مخلص سمجھنے کے بجائے دشمن سمجھ لیا اس لیے نظم بے نظیر وہ جابجا سرسید کی خدمات اور ان کی اہمیت و حمیت پر بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خدانے سرسید کو دی توفیق غم خواری
عطا کی عقل صائب جامع دنیا دین داری
اُس کی سخت حاجت مند تھی یہ قوم بچیاری
علاج آسان ہے جب ہوگئی تشخص بیماری
اس نے سب سے پہلے عزت اور دولت کا گر سمجھا
خوف کو اس نے گردانا خزف اور در کو ڈر سمجھا(۹)

سرسید کی ان خدمات کے باوجود بھی مسلمانوں کی حالت ''ڈھاک کے تین پھات'' جیسی رہنے پر ڈپٹی نذیر احمد کڑھتے ہیں اور مسلمانوں کو خود فریب کہتے ہوئے نظر آتے ہیں، لکھتے ہیں۔

تو دیکھا کر بیٹا ہے یا کوئی پاوا
ہے بگڑا ہوا سہارا آوے کا آوا
نہ پہلے ہی شہباز تھے اور نہ لب ہیں
شراب تغافل سے بدمست سب ہیں(۱۰)

کسی بھی قوم کے اگر تہذیبی عناصر پر بات کی جائے تو ان میں فنون لطیفہ، ثقافت، سماجی ترقی اور اس کی رفتار حکومتی نظام و حکومتی عمل داری، زبان و تحریر اور معاشی حالت کو موضوع بنایا جاتا ہے۔

کسی بھی معاشرے کو مہذب تب سمجھا جاتا ہے جب اس کے تمام تر تہذیبی عناصر میں توازن ہو۔ جب ایک ملک یا معاشرے میں انصاف کا نظام ہو، لوگوں کا طرز زندگی شاندار ہو اور معاشی حالات مستحکم ہو اور حکومتی سطح پر خود مختاری اور آسودگی نہ ہو۔ اور انصاف کا نظام مہذب معاشرے میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ جن معاشروں میں انصاف کا یقینی نظام موجود نہ ہو وہ تہذیب جلد شکستہ حال ہو جاتی ڈاکٹر آصف لکھتے ہیں:

''تہذیب کے صرف خارجی مظاہر نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کا ایک دل و دماغ بھی ہوتا ہے۔
یعنی ایک فکر یا فلسفہ زندگی حسن کے بغیر تہذیب محض ایک ڈھانچہ رہ جاتی ہے۔''(۱۱)

کسی بھی قوم کی فکر، عقائد اور خیالات میں تبدیلی کی وجہ سماجی روابط آلات و اوزار، مشرقی پسندی، جدت کی قبولیت اور علم و ہنر ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی قوم ان چیزوں میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی تو وہ ایک مہذب قوم نہ کہلائی جا سکتی، برصغیر میں بالخصوص مسلم قوم علم و ہنر سے عاری تھی۔ کسی بھی طرح کی روشن خیالی پر براہ راست جملہ شمار ہوتی اور عقائد ایمان کی سطح پر مضبوط اور استعمار کاروں سے فطری نفرت نے مسلمان قوم کو بنادیا چونکہ انھوں نے خود کو بدلنے اور بدلتے دور سے آہنگ ہونے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی نظم بے نظیر میں مسلمانوں کو حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا اور ان کے ماضی کو جھنجوڑا، تاکہ وہ زمانہ شناس بنیں اور اپنی صلاحیتوں کا درست استعمال کریں۔ مگر مسلمان اپنے دقیانوسی خیالات پر ڈٹے ہوئے تھے اور آپس میں بھی مختلف طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اس بات کا شدت سے احساس تھا اور وہ اس

طرح کے عوامل پر مبنی قوم کو قوم نہیں بلکہ ایک طرح کا ہجوم سمجھتے تھے جو اندھیرے میں تیر چلانے میں مصروف تھی ۔کہتے ہیں:

و لیکن ہم کو تم کو قوم و قومیت سے نسبت کیا
مسلمان گور میں ہیں اور کتابوں میں مسلمانی
با ایں نا اتفاقی جو مسلمانوں میں واقع ہے
انھیں اک قوم کہنا ہی سراسر جہل و نادانی (۱۲)

معاشرے میں اخلاقیات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اخلاقیات در حقیقت زندگی کا طرز عمل ہے۔ معاشرے میں انسان کا اخلاقی قدروں سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ معاشرے میں کون سے سا عمل درست ہے یا نہیں۔اور اس طرح وہ اپنے نقصانات اور فوائد سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ ذلتوں، ظلم اور المناکیوں سے بھری پڑی ہے، وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر چلتے آئے ہیں ۔اس کے علاوہ انہیں کوئی راہ دکھائی نہیں دی۔ مسلمان یا خود پر ہونے والے مظالم پر بین کرتے ہیں یا پھر عظیم الشان ماضی کے گن گاتے ہیں۔ان چیزوں سے فرصت مل جائے تو احتجاج کرنا شروع کر دیتے ہیں دیوانے ہیں۔ تو چیخ پکار کر دل کو بہلا لیتے ہیں۔ دانا طبقہ اپنی فکر فرسائی سے کبھی کبھی کوئی حل نکال بھی لیتا تو کوئی ان کا ہم رکاب نہ بنتا۔ یہ مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ ہیں۔تسائل پسندی یا پھر اذیت پسندی، بہر حال مسلمانوں کی حالت زار ہی رہی۔

ہیں مطلب کہ ہم کو تخت ہو یا تاج شاہی ہو
ہیں خواہش کہ ہم کو سلطنت خواہی نخواہی ہو (۱۳)

مسلمان سماجی سطح پر دو طبقات میں بٹے ہوئے تھے، ایک طبقہ شریف کہلایا تو دوسرا کمین، "شریف" کہا جاتا جو معاشرے کے سب سے نکمے ترین لوگ ہوتے، یہ لوگ جاگیردار یا عہدار ہوتے۔ صرف عیاشی کرتے اور اس کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ یہ طبقہ در حقیقت داخلی استعمار کاروں پر مشتمل تھا جو سادہ اور ہنر مند لوگوں کی محنت کا پھل کھاتا۔ اور کمین طبقہ محنت کشوں کا تھا۔ جس کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی۔ اگر ان کو کوئی پناہ کی جگہ ملتی تو وہ تھا صرف مذہب اور مذہبی حد بندیاں بھی اس شریف لوگوں کے کاسہ لیس مذہبی نمائندوں کی بنائی ہوتیں۔ جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ جیسے رعیت کو چاہیے کہ وہ بادشاہ کے فرمانبردار ہیں اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔ اس سوچ سے جاگیردار طبقات نے اوپر سے نیچے سادہ عوام کو اس دھوکے میں رکھا اور اپنی من مانیاں کیں۔

نمونے بہ افراط پیش نظر ہیں
مگر چونکہ دل کو رہیں بے بھر ہیں
نہ جانیں حدیث اور نہ قرآن سمجھیں
نبوی النفس کو عین ایمان سمجھیں(۱۴)

سرسید صحیح معنوں میں قوم کے نبض شناس تھے۔ انھوں نے ایسی قوم کی تربیت کے لیے "تعلیم" کو ہی حل سمجھا۔ اور اپنے تیئں ہر ممکنہ کوشش کی۔ یہ بات واضح ہے کوئی بھی قوم تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ مگر مسلمان قوم ایسی قوم تھی جس کی ہر سطح پر تربیت ضروری تھی۔ کیونکہ ایسی قوم جہاں فکری جمود ہو، ماضی پرستی ہو، دین کی درست تعلیمات نہ ہوں، ترقی پسندی یا نئے خیالات سے باقاعدہ نفرت کی جاتی ہو۔ اور بے حسی کا یہ عالم ہو کہ نہ حکومت کی فکر اور نہ ہی غلامی سے نجات کی آرزو۔

تو اس صورتحال میں طبقات کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئی تھیں۔ اور اس ہجوم نما قوم میں قائدین کی تعداد ہی کتنی تھی۔ جن لوگوں نے ان کی حالت زار پر رحم کیا کہ ان کی اصلاح کے لیے اگر کوئی چارہ جوئی کرنا چاہی تو معتوب ٹھہرا۔

سرسید اور اس کے رفقاء نے تعلیم کو عام کرنے کی ہر کوشش کی۔ اولاً احیاالعلوم کی کوششیں ان کی متاثر کن ہیں۔ سرسید جانتے تھے کہ مسلمان سیاسی سطح پر کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔ اور نہ ہی ان کے پاس کسی طرح کی طاقت ہے کہ جو استعمار کاروں کے خلاف استعمال کی جاسکے۔ اس لیے انھوں نے تعلیم کا انتخاب کیا اور کوشش یہ کی نوجوانان اسلام کو جدید ترین تعلیم دی جاسکے، سرسید جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے اجتماعی سطح پر واقعی فلاح و بہبود چاہتے ہیں تو فقط مذہبی جذبائیت اور ملی اتحاد سے کچھ حاصل نہیں۔ اپنی ذاتی خود مختاری کے بین کرنا یا اپنی حالات پر بے حسی سے قائم رہنا مسلمانوں کے لیے زہر قاتل تھا۔

ہندوستان میں استعمار کاروں کا احسان یہ تھا کہ انھوں نے ذرائع نقل و حمل، تعلیم، صحت، نظم و نسق، بنکوں کا قیام، اناج کی فراہمی کے کچھ ذرائع کے ساتھ ساتھ Law and Justition کا نظام بھی قائم کیا۔ جس سے عام انسانوں کو فائدہ ملا۔ مگر جاگیرداروں کے دور میں ایسی کوئی سہولت عوام کو میسر نہیں تھی۔ دنیا تیزی سے ترقی کر رہی تھی مگر ہندوستانی سماج اب بھی پرانی قدروں پر ڈٹے تھے جس سے ان پر انگریز نہیں اگر کوئی دوسری قوم بھی حملہ کرتی تو قابض ہو جاتی۔ اس لیے ضروری تھا کے اس قوم میں ارتکاب عمل کی صلاحیت کو ابھارا جائے اور ایک جدید معاشرے کی تشکیل کے لیے ان کو ہنر مند بنایا جائے۔

انگریز استعمار کاروں کی حکومت کو ڈپٹی نذیر احمد خدا کا کرم کہتے تھے۔ وگرنہ مسلمانوں کی جو حالت نوآبادیاتی دور میں تھی۔ ایسی پہلے کب تھی۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کے ناتواں کندھے اس بوجھ کے متحمل ہی تھے

کہ وہ کسی بھی طرح کی سیاسی عملداری میں کردار ادا کر سکتے۔ در حقیقت معاشرے میں رہنا کیسے ہے اور حکومت اور حکومتی نظام کیا ہوتا ہے یہ بھی انہی استعمار کاروں کی دین ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

زوال حکومت بظاہر پر سزا تھی
مگر اس کی رحمت کی یہ اک ادا تھی
ہمیں ناتواں اور ضیف اس نے پایا
سروں پر سے یار حکومت اٹھایا(۱۵)

ڈپٹی نذیر احمد نے انگریز استعمار کاروں کو کسی بھی طرح ظالم نہیں کہتے، بلکہ کہتے ہیں حق تو یوں تھا کہ مسلمان ان کی اس حکومت سے فائدہ اٹھاتے، علم و ہنر سیکھتے اور معاشرے معزز بن جاتے، کیونکہ اس سے پہلے وہ جس ماضی کو عظیم الشان گردانتے ہیں وہ بالکل ایسا بھی نہیں ایک تاریکی اور جہالت کا دور تھا۔ جہاں مسلمانوں کی کوئی ذاتی تہذیب نہیں تھی، بلکہ صرف مذہبی عقائد کی وجہ سے انہوں نے کئی مذہبی رسوم و رواج کو ثقافت میں شامل کر لیا تھا۔ جہاں عورتوں کو کوئی آزادی حاصل نہیں تھی۔ عورتوں کی صلاحیتوں کو دبا دیتا اور علم و ہنر سے دور رکھا جاتا۔ پھر اس کے بعد یہ کہہ کر عملداری سے دور کر دیا جاتا کر عورت ذات فی نفسہ کم عقل ہوتی ہے۔

مسلمان زمانہ شناس نہ تھے۔ بلکہ دقیانوسی خیالات میں اپنا مستقبل دیکھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی نظموں کے ذریعے مسلمانوں کی حالت کو ان کے سامنے رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ کسی بھی طرح کی عبرت پکڑ کر اپنی اصلاح کریں اور انگریزوں کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مصلحتاً ان کے ساتھ شیر و شکر ہو کر ترقی کے عمل کو سمجھیں اور خود کو جدید ترقی یافتہ قوموں کی صفوں میں کھڑا دیکھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

اگر ان سے شیر و شکر ہو کے رہتے
تو ہوں آج کو یہ تکالیف سہتے
ہنر سیکھتے خوب دولت کماتے
مزے کرتے گھر بیٹھے بغلیں بجاتے(۱۶)

اب تک سیاق وسباق سے جن پہلوؤں کو شامل بحث بنایا اس سب کے باوصف ڈپٹی نذیر احمد نے جو منظر نامہ مسلمانوں کا اپنی نظم بے نظیر کی نظموں میں پیش کیا وہ بھی مردہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ مگر برگستہ طالع، فکری جمود اور خود فریبی کا ایسا دور دورہ تھا کہ ناصح خود معتوب بن گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی نصیحتوں کا اثر کیا ہوا، یہ باتیں کجا، سرسید کے حالات کی تاریخ گواہ ہے۔

یہ بات اب ثابت ہے کہ کوئی بھی قوم معاشی ترقی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ اور جو لوگ معاشی سطح پر بے بال و پر ہوتے ہیں، ایسے لوگ اپنی جگہ مذہب میں ڈھونڈتے ہیں۔ اور خود پر ہونے والے ہر ظلم کو خدا کی آزمائش کا نام دیتے ہیں۔ اور زندگی میں کچھ نہ کر سکنے والی ناکامی کو قسمت کا لکھا قرار دیتے ہیں۔ مسلمان برصغیر میں اپنے Down Fall کے بعد اپنی سماجی حیثیت کھو چکے تھے۔ ان کی کوئی معاشی حیثیت نہیں تھی۔ قوم کی ایک بڑی تعداد جو مفلس و مقہور تھی اس نے مذہب میں پناہ ڈھونڈی اور کسی حجرے میں بیٹھ کر کسی کرشمے کا معجزے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ ان کی بے بسی اور لاچاری کی کوئی آخری حد ہو سکتی تھی مگر مسلمان پھر بھی اپنے روایتی انداز بدلنے اور چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

افلاس سے زیادہ جہاں میں نہیں وبال
افلاس ہے مقدمہ قہر ذی الجلا

افلاس کر ہی دیتا ہے انسان کو پائمال
ڈرپوک پست ہمت و ست و دنی خیال
مفلس کہ اس غریب کی دنای نہیں دوست(۱۷)

مسلمانوں کا وطیرہ یہ تھا کہ وہ اپنی ان تمام کمزوریوں کے باوصف معاشرے کو بدلنا چاہے تھے۔اُن یقین محکم تھا کہ وہ اپنے اسلاف کے راستوں پر چل کر اپنے لیے ایک دنیا بنا سکیں گے۔اور دنیا کا مقابلہ کر سکیں گے۔ مسلمان بود و باش سے لے کر پیدوار کے ذرائع تک بدلنے کو تیار نہیں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اپنے ان عوامل سے تغیر پیدا کر کے دوبارہ اپنا وقار حاصل کر سکیں گے۔ مسلمانوں کا یہ عمل گویا ایسا تھا کہ ''اندھیرے میں تیر چلانا''اور ان کو نصیحت کرنے والوں کی بات ایسے تھی جیسے کوئی صحرا کا موذن ہو اور لوگوں کو فلاح کی طرف بلاتا رہے مگر اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دے مگر پھر بھی ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

سوجو تو کچھ بھی نیست کو نسبت ہے مست سے
تم چاہتے ہو کام بلندی کا پست سے
کیا خیر ہو سکے گی بھلا تنگ و درست سے
کوڑی تو لے ادہار کوئی فاقہ مست سے(۱۸)

مسلمانوں کی سماجی زندگی میں دین کا بڑا عمل دخل ہے۔ مگر ان کے پاس جو دین تھا وہ نہ تو دین کی اصل تعلیمات تھیں۔اور نہ ہی خدا کے احکام،اس حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی نے خوبصورت بات کہہ رکھی۔

''خاص بات یہ ہے کہ انتہا پسند مذہبی جماعتیں مغرب کی جدید ٹیکنالوجی کو خوشی سے اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ ان کے نقطہ نظر سے ٹیکنالوجی غیر جانبدار ہوتی ہے۔اور اسے

جس طرح چاہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر سماجی، سیاسی اور ثقافتی اقدار خطرناک میں کیونکہ ان سے عقائد پر ضرب پڑتی ہے۔ اس لیے مغربی افکار و خیالات، مذہبی انتہا پسندی کے مقابلے میں اسلام کی ترقی کا نظریہ اپنی جڑیں مضبوط نہیں کر سکا۔"(۱۹)

استعمار کاروں، جدت پسندوں، قدامت پرستوں اہل علم کے ساتھ ساتھ ایک ایسا گروہ بھی تھا جسے ہم آج کی زبان میں "جہادی" گروپ کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایسا گروہ تھا جو علم کے بجائے عمل پر یقین رکھتا تھا۔ اور ان کے عمل کے معیارات الگ تھے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ ایسی تمام تر طاقتوں جو اسلامی تعلیم، اسلامی تہذیب و اقدار کے خلاف ہیں یا تصادم کرتی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے ان تمام عناصر کو ختم کر دے اور اپنی جان کی بازی تک لگادیں اور یہ گردہ کسی بھی طرح کی سنسنی، تکنیکی، عملی و عقلی بحث مباحثے کو نہیں سمجھتا تھا۔ وہ فقط اپنے داخلی تصورات و خیالات کے ساتھ ہر طرح کی بربریت و دہشت گردی کو درست سمجھتا اور دشمن عناصر کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن گروہوں نے حصہ لیا تھا ان میں کثیر تعداد ایسے خیالات کے حامل لوگوں کی تھی۔

ہندوستان میں استعمار کاروں سے پہلے ریاستی ڈھانچہ یہ تھا کہ سادہ لوح عوام الناس کو جاہل اور غریب رکھ کر ان کو سماجی اور ذہنی سطح پر پسماندہ بنادیا جائے۔ اور ریاست اپنے اس فیصلے میں عوام کو اپنے کنڑول میں رکھنے کے لیے اکثر و بیشتر تو مذہبی سہارا لیتی یا پھر حب الوطنی کو چورن چٹایا جاتا۔ اور سادہ عوام نعرہ تکبیر لگا کر رزم گاہ میں اتر جائے۔ مسمانوں کی جو ذہن سازی کی جاتی اس میں یہ ان کو باور کروایا جاتا کہ دنیاوی مسائل یا دنیاوی زندگی عارضی ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ ایک مسلمان کو دنیا کا خیال دل میں نہیں پالنا چاہیے بلکہ اپنی عبادت اور ریاضت سے اپنی آخرت سنوارنی چاہیے۔ ڈپٹی نذیر احمد اس تناظر میں لکھتے ہیں کہ:

ممکن نہیں ہے دین میں دنیا نہ ہو دخیل
ایسا خیال کر نہیں سکتا کوئی عقل
پروردگار جس کا نہیں ہے کوئی عدیل
کیوں چاہنے لگا کہ مسلمان رہیں ذلیل(۲۰)

ڈپٹی نذیر احمد جس کا خواب دیکھ رہے تھے یا دیکھا رہے تھے اس راستے میں کئی طرح کے مسائل حال تھے۔

اولاً جو علما حضرات امت مسلمہ کو درس کے فرائض سر انجام دے رہے تھے وہ زیادہ تر اپنی تبلیغ اردو فارسی یا عربی زبان میں کرتے اور زیادہ سے زیادہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو موضوع بناتے اور پھر اپنے حال پر ماتم کرتے اور ان مقامی زبانوں کو استعمال کرنے والے لوگ راسخ العقیدہ تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبان میں لکھی گئی مذہبی کتابوں کو نئی وہ دین و دنیا کا نصاب سمجھتے اور بہ صورت اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے بلکہ لوگوں کو کئی وسائل سے ہٹا کر عمل پیرا ہونے کا حکم صادر فرماتے۔

اس لیے ایسے لوگوں کے سامنے آزاد خیال، رئیس خیال یا پھر لبر مسلم کی وقعت نہیں تھی۔ اس لیے جدید خیالات و فکار عام دلوں/ مسلمانوں تک نہ پہنچ پاتے جس کے سبب عام لوگ اسی ماضی پرستی اور دقیانوسی خیالات کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

کیا فائدہ کہ جو تذکرہ ماضی کریں
کیوں باد رفتگان میں ماتم بپا کریں
بے سود گرچہ تابہ قیامت بکا کریں
اک امر اختیار سے خارج ہے کیا کریں(۲۱)

ڈپٹی نذیر احمد نے بر صغیر کے مسلمانوں کو اپنی سماجی حالت بدلنے کے جو مشورے دے جو عملی کوششیں کیں وہ تفصیلاً بیان کر چکی ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد ہر گزایسا نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزوں کے تابع رہیں یا پھر اپنی ترقی ان کے نیچے رہ کر کرتے ہیں بلکہ وہ تو اتنا بھی کہتے تھے کہ انگریزوں نے کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا کر وہ استعمار زدہ قوم کی حالت سنوارتے رہیں یا ان کو جدید دنیا میں رہنے کے ہنر سکھاتے رہیں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ جدید ترین علوم سیکھیں، سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کریں اور خود کو ایک مہذب قوم بنائیں اور پھر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔انگریزوں یا انگریزی زبان سے نفرت خود مسلمانوں کے لیے زہر قاتل تھی۔کیونکہ دنیا کے جدید ترین علوم اس وقت بھی انگریزی زبان میں تھے،انگریزی زبان ایک ایسا میڈم تھا جس کو اختیار کر کے مسلمان بھی جدید علوم حاصل کر سکتے تھے۔اس لیے مسلمانوں میں پائی جانے والی تہذیبی نفرت مسلمانوں کی ساکھ کو نقصان پہنچار ہی تھی۔اس تناظر میں ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

ہم کو توقعات نہ رکھنے کی وجہ کیا
یورپ نے کچھ خدائی کا ٹھیکہ نہیں کیا
دو تین چار ہاتھ کھیلنا ضرور ہے
مانہ کہ ہم سے منزل مقصود دور ہے(۲۲)

فنونِ لطیفہ کسی قوم کی اجتماعی تہذیب میں لوگوں کے مزاج اور شوق کا حصہ پیدا کرتا ہے۔تاریخ میں ہزار ہا ایسے واقعات موجود میں جس میں فنون لطیفہ کی مدد سے لوگوں کو ایک پیج پر اکھٹا گیا اور انہوں نے ایک قوم بن کر دکھایا۔مگر ڈپٹی نذیر احمد بر صغیر میں موجود کئی نابغہ روزگار سے نالاں نظر آتے ہیں۔ان کا یہ ماننا تھا کہ اس طبقے کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے علم وہنر سے لوگوں کی تربیت کرتے مگر شومی قسمت ان لوگوں کو اشعار کی آرائش و تزین سے

فرصت کہاں، عشق و عاشقی اس کا مرغوب ترین پیشہ ہے اور یہ سکون محسوس کرتے ہیں کہ بیٹھے رہیں، تصور جاناں کئے ہوئے۔

ان کے دل میں خلق خدا کے لیے کوئی جذبات نہیں۔ ان کی حالت زار پر ان کا دل نہیں پھٹتا ڈپٹی نذیر احمد خود اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ شاعری ان کا میدان نہیں مگر اس میدان میں فکری ویرانی دیکھنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ اب ناول نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی موضوع بنایا جائے اور انہوں نے ایسا صرف مقصدی ضرورت کے لیے کیا اور اپنے اس عمل پر وہ خاصے مطمئن بھی نظر آتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں کہ :

قابلیت جو تھی سب صرف ہوئی لفظوں میں
اور مضامین کسی اگر پوچھو تو لیس خیریت
وہی اک عشق کا روتا ہے براک صورت ہے
نہ لگائے کسی بندے کو خدا اس کی لت(۲۳)

ڈپٹی نذیر احمد نے اس سماجی و تہذیبی تغیر مسلم و ہنر پر رکھی۔ اور قوم کو احساس دلانے کی کوشش کی کہ کوئی بھی قوم اس وقت ترقی حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ خود کو تعلیم و ہنر میں خود مختار نہیں بنالیتی۔ ڈپٹی نذیر احمد یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر ماضی میں مسلمانوں نے کوئی ترقی کی تھی تو اس کی وجہ بھی علم و ہنر ہے۔ عرب بدوؤں کا علاقہ تھا۔ آنحضورؐ نے اپنی علم و فضیلت کے ذریعے اس خطے کو علم کا گہوارہ بنایا اور وہ پوری دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، یہ مسلم قوم کے لیے ازبس ضروری ہے کہ ماضی پرستی یا تقدیر پرستی کی روش کو چھوڑ دیں اور ارتکاز عمل سے مذہبی سطح پر اجتہاد کو رواج دیں تاکہ اسلام کو جدید دور کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاسکے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

بس غنیمت ہے کہ قرآن سے پیچھے نہ رہیں
دور میں گر نہیں، تقدیر میں اپنی سبقت
یہ بھی موقوف ہے تعلیم پہ، اعلیٰ تعلیم
بی اے اور ایم اے اس کی تو ہے بابت حاجت(۲۴)

مسلمانوں کو ایک اب خواب غفلت سے جاگنا ہوگا۔ کیونکہ ہمیشہ آسودہ زندگی گزاری تھی۔ اس لیے ان کو وقت کے بدلتے تقاضوں کی چنداں فکر نہیں۔ تھی۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہمیں زوال نہیں ہے۔ اور ہم اسی طرح حکمران رہیں گے۔ مگر جب وقت نے کروٹ لی تو معلوم ہوا معاشی حالت کی زبوں حالی کیا ہوتی ہے۔ اور بے بسی کا غم کیا ہوتا۔ رجائیت کی بات یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد بتاتے ہیں کہ اگر وہ وقت آیا ہے تو روشن دور بھی آئے گا، مگر ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو بدلیں اور ایک مہذب قوم بنائیں۔

جب تک ہماری قوم میں تاج رنگیں رہا
ہم میں کسی کو فکر معیشت نہیں رہا
کس کس کا نام لیں کہ جناں اور چین رہا
ہر فرد عافیت سے غنا سے قریں رہا (۲۵)

یہاں تک ہم نے ڈپٹی نذیر احمد کی نظم بے نظیر میں مقامی تہذیب اور معاشرت کی ابتری کی وجوہات کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اور ساتھ میں ہم نے ڈپٹی نذیر احمد کی فکر کو بھی موضوع بحث بتایا کہ وہ کسی طرح وکٹوریہ نو آبادیاتی حکام میں ان تمام مسائل کا حل دیکھتے تھے۔

اولاً انہوں نے بر صغیر میں بالخصوص مسلم اقوام کی اخلاقی بد حالی کی وجہ مذہبی جمود زدہ فکر کو قرار دیا کہ روایتی اور دقیانوسی تصورات نے مسلمانوں کو ارتکاز عمل سے دور کیا۔ انھوں نے مذہب کی غلط تشریحات کو استعمال کیا اور محدود ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر حکمران طبقوں کا مذہب کا استعمال کرنا ہے، خطرناک حد تک نقصان دہ رہی۔ رعیت یا سادہ عوام کو اپنے کنڑول میں رکھنے کے لیے امرائے ریاست اور سیاست میں مذہب کو حد درجہ استعمال کیا مذہبی نمائندوں کو دربار میں عہدے دیے جو اپنے مالک کی خاطر قرآنی آیات و احادیث کی سیاسی ضرورتوں کے تحت تشریحات کرتے اور فتاوی جات از روئے قرآن و حدیث جاری کرتے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ ان تعلیمات کا اصل دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان تمام چیزوں نے مسلمانوں کو وحشت زدہ قوم بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور جدید دنیا نے انھیں جمود زدہ قرار دیا۔ مذہبی و اخلاقی اصلاح پسندی کے باب میں سرسید ان کے رفقا کی کوشش لائق تحسین ہیں۔ مگر صدیوں کی روایتی اور جمود زدہ سوچ کے سامنے وہ کچھ زیادہ پر تاثیر ثابت نہ ہو سکے۔ سرسید کے جدید دنیا کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی مذہب اسلام مکمل طور پر فطری دین ہے۔ اور کوئی ایسا نظام نہیں جس کی تفہیم عقلی سطح پر نہ ہو سکے۔ اس کے لیے انہوں نے حسب مقدور سائنسی تفہیات بھی کیں۔ مگر انہیں یا تو فطری کہا گیا ہے یہ پھر محلد۔ سرسید کی اپنی تعلیمات اور منشور کو آگے بڑھانے کے لیے ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اپنی مقدور جو کوششیں کیں وہ بھی لائق تحسین ہیں۔

ایسا بالکل بھی نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید کی یہ تمام کوششیں بے گار گئیں اور ایک بڑے پیانے پر تغیر جو دیکھنے کو ملا اس کی وجہ سماجی و اخلاقی سطح پر تعلیم کو عام کرنا تھا۔ سرسید کی تعلیمی پالیسوں نے مسلمان نوجوانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کیا اور ان کی فکر بدلتی چلی گئی۔ اور صرف علی گڑھ کالج کے روشن خیال طلبہ نے اتنا کام کیا کہ جو بعد میں کئی تحریکوں اور رجحانات کے لیے منشور کا درجہ رکھتے ہیں۔ مذہبی و اخلاقی سطح پر جب وکٹوریہ دور میں علم کے

ذریعے مزاحمت پیدا کی گئی تو مذہبی نکتہ نظر میں ایک روشن فکر تحلیلی عمل نظر آیا۔ جس میں انگریزوں اور انگریزی زبان سے نفرت کے جذبات دم توڑتے ہوئے نظر آئے۔ اور مسلمان نوجوانوں کے ایک بڑی تعداد نے جدید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

وکٹوریائی تصور اخلاق میں سماج کی فلاح و بہبود اور انصاف کا نظام قائم کرنا بھی شامل تھا۔ بس خواتین کو سماجی و شخصی آزادی کا بیان بھی شامل تھا۔ وکٹوریائی دور میں ایک بڑے پیمانے پر سماجی ترقی کے ذریعے انھوں نے عمل میں لایا گیا ذرائع نقل و حمل Law and Jastiucal سمیت روایتی تہذیبی انفعالیت کو نئی تہذیبی و اخلاقی اقدار سے بدل دیا گیا۔ سرکاری دفاتر اور فیکٹریوں کی وجہ سے ایک برے پیمانے پر روزگار کے مواقع پیدا کیے گئے۔ لوگوں نے جدید آلات کو استعمال کرنا شروع کیا اور کھیتی باڑی سے نکل کر کاروبار میں بھی قسمتی آزمائی کرنے لگے۔ کاروباری حلقوں میں حوصلہ کن رد عمل کی وجہ سے کئی لوگ کاروبار میں بھی کامیاب ہوتے ہوئے نظر آئے۔

استعمار کاروں سے پہلے جو سہولیتں فقط امیروں، وڈیروں اور راجاؤں کو حاصل تھیں اب ایک عام آدمی اپنے محنت سے اپنی سماجی زندگی کو بدل کر انفرادی ترقی کرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس تناظر میں ضرورت تھی تو اس عناصر کو ختم کرنے کی جو تخریب کار تھے۔

اس کے لیے وکٹوریائی دور میں تعلیم اور روزگار کے مواقعوں کو بڑھانے کی کوششیں کی گئیں جس سے ایک بڑے پیمانے پر فرق نظر آنے لگا۔

اگر بات کی جائے کہ تاریخی اور معاشرتی سطح پر ایسے کونسے مسائل تھے جو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں حائل تھے تو ان پر تفصیلاً بات کر چکے ہیں اور تاریخی و زمانی حقائق سے سند دے چکے ہیں لیکن یہ بات یہاں غیر مناسب نہیں

ہو گی کہ مسلمانوں کی وکٹوریائی دور میں اصلاح ایسی تھی جیسے ایک نومولود کی پرورش اور تربیت کی جائے اور یہ فریضہ سرسید اوران کے رفقانے باخوبی سرانجام دیا۔

ہم نتیجتاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد ایک تاریخی موڑ تھا۔انگریزوں نے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کو ضرور خلفشار کیا مگر برصغیر میں اس نوآبادیاتی فکر کے زیر اثر ڈپٹی نذیر احمد نے مسلمانوں کی معاشرتی، تمدنی اور تعلیمی پسماندگی کے لیے تعلیمی واصلاحی مقصد کو انھوں نے اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ڈپٹی نذیر احمد اپنی اس کوشش کے اور فقط یہی خواہش کرتے ہیں کہ :

ہوں برسر عروج خیالات قوم کے

شایان شان قوم ہوں حالات قوم کے

ڈپٹی نذیر احمد نے نظم بے نظیر میں تعلیم پر زور دیا ہے۔ لیکن پس پردہ تہذیب واخلاقی اقدار کو پیش کیا ہے۔ انسان کا مہذب ہونے کے لیے تہذیب اور اخلاقی اقدار کے جملہ لوازمات کو اپنانا ضروری ہے۔ سچ بولنا دوسروں کے کام آنا، تعلیم یافتہ ہونا، فطرت میں غیرت اور حمیت کا ہونا، حیااور شرمندگی کا پایا جانا سماج کے دوسرے افراد کے خوشی اور غم میں شرکت کرتا، چھوٹوں سے پیار و محبت اور بڑوں کا احترام اور عزت کرنا انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں کو پوری طرح سے نبھانا والدین کے حقوق کی ادائیگی، بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بہ حسن خوبی انجام دینا، چغل خوری سے اجتناب دوسروں کے تئیں سوئے ظن کی بجائے حسن ظن رکھنا صفائی ستھرائی کا پورا پورا خیال رکھنا، باہم گفتگو میں رہتا، مناسب لب ولہجہ اپنانا، تکلم سے قبل قوت فکر کو کام میں لانا، باادب اور باعلم کی صحبت میں اعتدال پسندی، عدل وانصاف کو لازم پکڑنا، توہمات اور بدعقیدگی سے دررہنا، یہی سب تو تہذیبی واخلاقی اقدار کے لوازمات ہیں۔ان سبھی کو ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی نظم بے نظیر میں مختلف فصول میں مختلف موقعوں پر پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مسدس حالی، حالی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵، ص ۴۷

۲۔ نظم بے نظیر، ص ۳۴

۳۔ علامہ اقبال، شکوہ جواب شکوہ: ترجمہ و تشریح لائن پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۴۰

۴۔ نظم بے نظیر، ص ۱۰۹

۵۔ نظم بے نظیر، ص ۱۱۹

۶۔ نظم بے نظیر، ص ۱۱۹

۷۔ نظم بے نظیر، ص ۱۱۹

۸۔ نظم بے نظیر، ص ۴۰

۹۔ نظم بے نظیر، ص ۱۱۷

۱۰۔ نظم بے نظیر، ص ۱۳۱

۱۱۔ ڈاکٹر محمد آصف، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش فکر اقبال کے تناظر میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹

۱۲۔ نظم بے نظیر، ص ۱۳۵

۱۳۔ نظم بے نظیر، ص ۱۲۲

۱۴۔ نظم بے نظیر، ص ۱۲۷

۱۵۔ نظم بے نظیر، ص ۱۳۰

۱۶۔ نظم بے نظیر، ص۱۳۱

۱۷۔ نظم بے نظیر، ص۱۶۸

۱۸۔ نظم بے نظیر، ص۱۶۹

۱۹۔ ڈاکٹر مبارک علی، گم شدہ تاریخ، گکشن ہاؤس، لاہور ۲۰۰۵ء، ص۴۵

۲۰۔ نظم بے نظیر، ص۱۷۰

۲۱۔ نظم بے نظیر، س۱۷۷

۲۲۔ نظم بے نظیر، ص۱۷۸

۲۳۔ نظم بے نظیر، ص۱۵۵

۲۴۔ نظم بے نظیر، ص۱۵۶

۲۵۔ نظم بے نظیر، ص۱۷۴

باب چہارم

شعری مجموعے نظم بے نظیر میں ڈپٹی نذیر احمد کا تصور اخلاق: تنقیدی تجزیہ

الف: تصور اخلاق: بنیادی مباحث

ب: ڈپٹی نذیر احمد کا تصور اخلاق: تنقیدی تجزیہ

ج: ڈپٹی نذیر احمد کے عمومی اخلاقی تصورات

۱۔ درستی عقائد مذہبی/مذہبی جمود کی بازگشت

۲۔ توہمات سے کنارہ کشی

۳۔ ماضی پرستی اور حال سے بے اعتنائی

۴۔ تعلیم کی اصلاح، انگریزی تعلیم کا رواج

۵۔ جدید سائنسی تعلیم کی ضرورت و اہمیت

۶۔ عورتوں کی حالت زار، امور خانہ داری

۷۔ کیثر ازدواجی صورت حال

۸۔ وکٹورین تصورِ اخلاق کی حمایت، برصغیر کی تہذیبی انفعالیت کو وکٹوریائی اخلاقی اقدار سے بدلنا

الف: تصورِ اخلاق: بنیادی مباحث

انسانی کردار کو مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور جانچنے کو تصورِ اخلاق کہتے ہیں۔اس مخصوص زاویہ نگاہ کا تعلق اس اخلاقی اقدار سے ہوتا ہے جو کسی فرد یا جماعت کی جداگانہ شناخت کا باعث بنتا ہے۔

اخلاقی اقدار میں تمنائیں، آرزوئیں اور چاہتیں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہیں جو خوب سے خوب تر کی جانب آمادہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں مقاصد اور اہداف معیارات اور اقدار، ترجیحات اور ترغیبات کا ایک سلسلہ کار فرما ہوتا ہے۔ایک سطح کردار کی وہ ہوتی ہے جو واقعتاً موجود ہوتی ہے اور دوسری سطح وہ ہوتی ہے جو اس کو اخلاقی اقدار کے تحت موجود ہونی چاہیے۔

تصور اخلاق اس فرق کو بتدریج کم کرنے کی لگاتار کاوش کا نام ہے۔ اخلاقی مسائل کا تعلق اسی نوعیت کی صورت حالات سے ہے۔انسانی کردار کے معیار کا تعین کرنا ایک معیاری علم ہے جسے تصور اخلاق کہا جاتا ہے۔

تصور اخلاق ایک ایسا نظام ہے جو ایک خوشگوار زندگی کے لیے ہمارے رویوں کی تشکیل کرتا ہے۔ تصور اخلاق وہ عظیم اور اساسی علم ہے جس سے انسان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار میں حریت، مساوات، صداقت، سچائیت اور رواداری نمایاں ہیں۔حیات انسانی میں تصور اخلاق انسان کو اچھے برے کی تمیز سکھاتا ہے، خیر اور شر کا صائب اور غیر صائب کا فرق واضح کرتا ہے۔

محمد حبیب الرحمن خان شیر وانی کے مطابق:

تصور اخلاق سے مراد

۱۔ عادتیں، خصلتیں

۲۔ خوش خوئی، ملنساری، کشادہ پیشانی سے ملنا، خاطر مدارت، آؤ بھگت

۳۔ جس میں معاد و معاش، تہذیب، نفس، سیاست مدن وغیرہ کی بحث ہو۔"(۱)

امیر اللغات کے مطابق:

"اخلاق، مذکر، خلق کی جمع اردو میں بیشتر واحد بولا جاتا ہے۔"

۱۔ خصائل و عادات

۲۔ انسانیت، ملنساری، مروت، آؤ بھگت

۳۔ وہ علم جس میں نفس اور معاد و معاش وغیرہ سے بحث ہو۔"(۲)

نسیم اللغات کے مطابق:

"اخلاق (ع) خلق کی جمع، عادتیں، خصائل، انسانیت، وہ علم جس میں تہذیب، نفس، تدبیر، منزل اور سیاست ملکی کے اصول بیان کیے جاتے ہیں۔"(۳)

آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری کے مطابق:

"اخلاقیات سے متعلق خصوصاً انسانوں کے باہمی روابط یا سماجی تعلقات کی نسبت سے Ethical اخلاقی طور پر Ethically، اخلاقیات Ethicality انسانی زندگی میں اصول، Ethic معیار اخلاق سے تعلق رکھنے والا علم، علم الاخلاق۔"(۴)

اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

"معاشرتی معاملات طے کرنے کے اصول، وہ بات جو بھلائی اور برائی کی تمیز پیدا کرے، جو فضائل و رذائل کا علم بخشے، ایسا ضابطہ جس کی پابندی کے بغیر اجتماعی زندگی کا تصور محال ہے۔"(۵)

یعنی کہ تصور اخلاق سے مراد مہذب معاشرے کی تعمیر کے لیے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا اطلاق ہے اور اس کے لیے مذہب اور معاشرے کے مقررہ کردہ اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنا ہے۔ مندرجہ بالا تعریفات سے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ خلق سے مراد تخلیق کیا جانا یا عدم سے وجود میں لانا ہے جبکہ خلق سے مراد نفس انسانی کی وہ صفات ہیں جو بغیر کسی ارادے کے اس کی طبعیت سے فطرتاً ظاہر ہوتی ہیں۔

اخلاق کا تعلق اصلاً کردار انسانی سے ہے مگر یہ ایک ایسی باطنی کیفیت کا نام بھی ہے جو نفسِ انسان میں اس قدر برقرار اور دائمی صورت میں موجود ہوتی ہے کہ انسان کی فطرت اور طبعیت بن جاتی ہے اور اس سے نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی فکر و ارادے کے اعمال صادر ہوتے ہیں جو کہ خلق کہلاتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر طبعی طور پر Ethical Motive محرکات اخلاق موجود ہوتے ہیں جن کی بنا پر اعمال صادر ہوتے ہین مگر ان محرکات کی صرف موجودگی سے انسان عمدہ اخلاق کا مالک نہیں بن سکتا جب تک ایسا ضابطہ اخلاق نہ اپنائے جو کہ معاشرے میں احسن طریقے سے طرز معاملات اور رویوں کے معیارات کے تحت متعین کیا گیا ہو۔ عقلی طور پر جائز اور قابل تحسین اعمال کو اخلاق حسنہ کہتے ہیں۔

تصور اخلاق اپنے اندر انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو ڈھالے ہوئے ہے اس میں خیر و شر کے درمیان فرق واضح کیا جاتا ہے، اچھائی کو اپنانے اور برائی سے اجتناب کرنے کی غایت اور پہچان کرواتا ہے۔ تصور اخلاق ہی سے انسان معتدل اخلاق اپنانے کے قابل ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسان کی اصلاح اور ضابطہ اخلاق مربوط ہوتا ہے، انسان کے اندر اخلاق محمودہ پر آمادہ ہونے کے لیے قوت ارادی موجود نہ ہو تو وہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ روزمرہ امور میں ریاضیت کے ذریعے ہی سے اخلاق حسنہ انسان کی طبعیت اور فطرت سلیمہ میں پیوست ہو سکتے ہیں، کسی بھی معاشرے کی بقا اخلاقی قدروں کے برقرار رکھنے اور عمل پیرا ہونے میں ہے۔

تصور اخلاق مہذب معاشرے کی تعمیر کے لیے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا اطلاق ہے اس کے لیے مہذب معاشرے اس کو مطمع نظر بناتے ہیں اور تعمیری، مثبت اور عوامی امنگوں کا پاس رکھتے ہیں۔

تصور اخلاق کے تین اہم نتائج ذیل ہیں:

۱۔ خود غرضی اور انفرادی مفادات کا خاتمہ ہوگا، اجتماعی اور قومی فلاح و بہبود کو ترجیح دی جائے گی۔

۲۔ عدل و انصاف کا قیام ہوگا، ظلم و ستم زیادتی، فرقہ واریت اور شدت پسندی کا خاتمہ ہوگا۔

۳۔ ہر شخص کو برابری کی سطح پر مساویانہ عدالتی، اخلاقی اور قانونی حقوق حاصل ہوں گے۔

ب: ڈپٹی نذیر احمد کا تصور اخلاق: تنقیدی تجزیہ

انسانی جذبات و احساسات کی ترسیل کے بہت سارے ذرائع ہیں جن میں ایک اہم ذریعہ نطق ہے۔ حیوان اور انسان کے مابین یہ ہی امتیازی فرق نمایاں ہے یعنی انسان کے اندر صلاحیت نطق ودیعت کر دی گئی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے جذبات و احساسات اور کیفیات نیز تصورات و تخیلات، واقفیت اور علم و آگہی سے اپنے ماسوا کے ذہن و دماغ تک رسائی کرتا ہے۔ زبان ترسیل کا اہم وسیلہ ہے۔ علمائے لسانیات نے زبان کے استعمال کی دو اہم کیفیتوں کا ذکر کیا ہے ایک نثر اور دوسری نظم۔

ادب کی تخلیق کے بہت سارے مقاصد بیان کیے جاتے ہیں اور اس موضوع پر طویل و عریض مباحث بھی ہوئے ہیں۔ تخلیق ادب کے مقاصد میں سے ایک مقصد ''افادیت'' بھی ہے۔ صرف قلبی سکون و اطمینان اور ذہنی فرحت و انبساط کے لیے ادب تخلیق کرنا اس کا مقصد نہیں جیسا کہ رومانوی، جمالیاتی اور تاثراتی ناقدین کا خیال ہے۔ بہت سارے ادبی اور ناقدین، ادب کی مقصدیت کے حامی نظر آتے ہیں۔

مغربی ادب میں ارسطو سے لے کر ٹی۔ ایس ایلیٹ سب ہی ناقدین ادب کی مقصدیت کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔ ان ہی مقاصد میں ان کا تصور اخلاق یعنی کہ سماج اور معاشرے کی اصلاح بھی ہے۔ عالمی ادبیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جان ملٹن، جارج برنالڈ شاہ، کولرج، میتھو آرنلڈ وغیرہ جیسے مشہور ادیب کے تخلیقات میں ان کا تصور اخلاق یعنی کہ انسان دوستی، وطن پرستی، انصاف پسندی اور خصوصاً اخلاقی نقطہ نظر سے آفاقی پیغام ملتے ہیں۔ ان سب ہی میں مقصدیت کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے اور ان مقصدیت میں تصور اخلاق یعنی کہ اصلاح کا ہی پہلو غالب نظر آتا ہے۔

اسی طرح سے مشرقی ادیب میں ابن راشد، ابن خلدون وغیرہ کی کتابوں میں اخلاقی اقدار اور ادب کے گہرے ربط کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے بقول ''ادب کو بامقصد بنایا جائے۔'' ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے باشندگان کو ہر اعتبار سے متاثر کیا۔ یہ عہد سیاسی اور سماجی طور پر شکست وریخت کا زمانہ ہے۔

ہندوستان کے سیاسی و سماجی اور معاشی افق پر تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور تہذیبی سطح پر تصادم اور تضاد کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ تعلیمی مسائل ہوں یا سیاسی پستی اخلاقی گروات اور معاشرتی زبوں حالی، ہر فرض سے انسانی زندگی کے جملہ مراحل میں اس انقلاب سے روح فرسا سے بری طرح متاثر ہوئے۔

ایسے ہی حالات میں ہندوستان میں کئی اصلاحی تحریکیں منظر عام پر آئیں جن میں ایک اہم تحریک سرسید کی تحریک تھی۔

جس کا بنیادی مقصد مسلم معاشرے میں اخلاقی اقدار کے حوالے سے ہر سطح پر اصلاح کرنا تھا۔ اسی مقصد کو سرسید اور ان کے رفقائے کار نے آگے بڑھایا۔

مولانا الطاف حسین حالی نے شاعری کی تمام اصناف کو بامقصد بنانے پر زور دیا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہائرائڈ کی مدد سے مناظمہ کا انعقاد کیا جس میں غزل کی طرح مصرع طرح دینے کے بجائے نظم، منظوم تخلیقات وجود میں آئیں۔ سرسید کے رفقاڈپٹی نذیر احمد نے قدیم خیالی قصوں داستانوں اور ماورائی عناصر سے احتراز کرتے ہوئے مقصدیت وافادیت کا احساس دلایا اور اپنے اسی مخصوص یعنی کہ مقصدیت وافادیت کو تصور اخلاق کے ذریعے نظم بے نظیر میں پیش کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کا تصور اخلاق، ''اصلاحی رجحان'' ہے۔ کیونکہ ان کا فن اور شخصیت اس میں مضمر ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے جاگیر دارانہ سماج میں آنکھ کھولی تو وہ نہایت ہی اتھل پتھل کا زمانہ تھا تعلیم سے دوری اور بے رغبتی عام بات تھی۔

خصوصاً مسلم معاشرہ میں ہر طرح کی اخلاقی اور سماجی گروا ٹ تھی ان کی تعلیم وتربیت بھی ایسے ہی ماحول میں ہوئی تھی۔ انگریزی کی تعلیم کو مسلم معاشرے کا ناسور سمجھا جاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو اس کی ضرورت محسوس ہوئی انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے یہ زبان سیکھی۔

ڈپٹی نذیر احمد نے انگریزی میں استعداد پیدا کرلی وہ انگریزی ادب کا مطالعہ کر سکتے تھے۔ انگریزی ادب کے مطالعہ نے انھیں مغربی ادب کی خصوصیات اور روایات اور اس کے مقاصد سے آشنا کیا جس کی بدولت یہ احساس ہوا کہ اپنی تخلیق کے ذریعے علمی معلومات اور اخلاقی واصلاحی درس دیا جاسکتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت پر تو اس کا اثر تھا اور دوسرے سرسید تحریک نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ سرسید تحریک جو مسلمانوں میں علم اور تعلیم کو فروغ دینا چاہتی تھی۔ ان کے اس عزم کو ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریکوں کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کا تصور اخلاق اصلاح پسندی سے منصوب ہے جو ماضی کی تمام زندہ اور پائندہ روایات کو حال کی محترک اور ترقی پذیر عوامل اور عناصر کی آمیزش سے مستقبل کے امکانات روشن کرنا چاہتے تھے اور ڈپٹی نذیر احمد مشرقی روایات واقدار کی پاسدار اور تہذیب وتمدن کے ضامن تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے جدت طبع سے یہ کمال دکھایا کہ ایسے دور میں جبکہ تہذیبی اور سماجی اقدار غیر واضح تھیں انہوں نے اپنی بصیرت اور غور وفکر سے کام لے کر ان کی بنیادی کڑیوں کی تلاش کی جس کی اصلاح پر قوم کا دار و مدار تھا اور جس کی اہمیت ہر دور میں اپنی جگہ مسلم ہے۔ڈپٹی نذیر احمد فرد اور سماج دونوں کی اہمیت اور مسائل سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ فرد اور سماج سے متعلق ان کا تصور اخلاق ان کی تحریروں کا محرک بنا جن پر اصلاحی نقطہ نظر غالب ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں ادب اور اخلاقی اقدار کا سنگم ان کی تحریر و تقریر کا خاص جوہر ہے۔ان کا تخلیقی جوہر خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو فکر وشعور کی ایک ایسی سمت ضرور رکھتا ہے جو بنی نوع انسان کو بقا کی جانب رواں رکھتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد فرد اور معاشرے کے تعلق کو استوار رکھنے کے لیے فرد کی انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ان کے پیش نظر تصور اخلاق عظیم اصلاحی اور فلاحی مقصد ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اخلاقی اقدار کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اخلاقی اقدار کا فروغ ان کا بنیادی مقصد ہے یہ انسان کو مصائب وآلام سے نجات دلا کر تسخیر کائنات کی جانب گامزن کرنا چاہتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا مقصد واعظ، تلقین یا نصائح کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے دوستی کا تعلق قائم کر کے، اس کی خرابیوں اور نقائص کی نشاندہی کر کے دوستانہ طریقے سے اس کے خاتمے کی تدابیر سبک انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر قاری خود بخود برائی سے نفرت اور نیکی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے تصور اخلاق کا مقصد انسانیت کی خدمت بھی ہے۔آسانیاں فراہم کرنے اور تقسیم کرنے کا درس ہے۔ڈپٹی نذیر احمد انسان کو تفہیم کائنات کا شعور دینے کے لیے بے تکان، بے شمار اور ان گنت اصلاحی نقطہ، جملے اور باتیں کہتے ہیں تاکہ ایسا معاشرہ وجود میں آسکے جہاں انسان اپنے اصل درجات سے واقف ہو سکیں۔

ڈپٹی نذیر احمد مہذب قوموں کے اوصاف اور جدید تہذیب کے تقاضوں سے آشنا تھے اور ان تقاضوں کی تکمیل کے بغیر وہ کسی بھی معاشرے کو مقبول و مہذب نہیں سمجھتے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ایک لیکچر میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس کی تعلیم کو دنیاوی فلاح و بہبود کا سبب بتایا ہے اور مسلمانوں کو سائنسی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔

> ''میں تعلیم کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر بس کروں گا سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تعلیم کیا ہے تعلیم کی غرض وغایت کیا ہے۔۔۔ پس تعلیم کے مفید اور مامفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی عافیت تعلیم کی دو شاخیں ہو گئیں۔جو تعلیم انسان کے قوائد عقلی کو ڈیولپ Develop کرے۔اس کو اہم دنیاوی تعلیم کہیں گے اور تعلیم انسان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرے یہ امر داخل بدہیت ہے کہ اہل یورپ کے قوائے عقلی بڑے زوروں پر ہیں اور ریل اور اسٹیمر اور تار برقی اور انواع و اقسام کی مشین ان ہی زوروں کے آثار ہیں۔وہ چار سیدھی سادھی کلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا خدا اعظیم ہے کہ ان کا کنسر کشن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے ذہن ہوں گے جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہو گا۔''(۶)

''اچھا تو یہ زور ان کے قوائے عقلی ہیں۔ یہ انتقال ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا۔ آب و ہوا تو ہی ہے جو پہلے تھی لیکن تاریخ بتا رہی ہے کہ اب سے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور بھیلوں کی طرح اہل یورپ بھی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بہت سے ملک میں جن کی آب و ہوا یورپ کے آب و ہوا سے ملتی ہے اور وہاں کے باشندے کندہ تراش ہیں ہو نہ ہو یہ ترقی یہ عروج جو اہل یورپ کو ہے سائنس کی تعلیم کا نتیجہ ہے جو یورپ میں تکمیل کے ساتھ دی جا رہی ہے اور گورنمنٹ نے کمال فیاضی سے اس کی ابجد نیٹوز (Natives) کو پڑھانا شروع کی ہے۔ 'فمنهم من آمن به قدمنهم من صدعنه' یعنی لوگوں میں کوئی اس (کتاب) پر ایمان لایا اور کوئی اس سے بھٹک رہا۔ صدعنہ میں کم نصیب، بد قسمت، بدبخت مسلمان ہیں جو اب تک اس جدید تعلیم کی طرف پس و پیش میں پڑے ہیں۔ پس اس کو تو خدا کی طرف سے فیصل شدہ سمجھو کہ دنیاوی بہبود و فلاح تو بدوں سائنس کی تعلیم کے ہوتی نہیں۔ اگر سائنس کے خزانے انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں ان صندوقوں کا کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ اور انہیں سیکھتے تو سلطنتیں کھو کر رعیت بنے رہو۔ آگے اپنے ابنائے جنہیں کی غلامی کرو، جھڑکیاں سنو، جوتیاں کھاؤ، اگلوں کا ڈھکا سنیا ہو سکے تو بھیک مانگو، مگر میری صلاح مانو تو سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر ڈوب مرو۔''(۷)

اس طویل اقتباس سے ڈپٹی نذیر احمد کے نظریہ تعلیم و ترقی خصوصاً سائنسی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد دنیاوی فلاح و بہبود اور قوائے عقلی کے نشو و نما کے لیے سائنس کی تعلیم کے حصول پر زور

دیتے ہیں وہ اس جدید تعلیم کا مذہبی عقائد کے ساتھ تصادم بھی نہیں بتاتے لیکن سائنس کے کرشموں اور ایجادات کو سراہنے کے باوجود انسانی عقل کی نارسائی پر ان کا یما ہے اور وہ ہر موجد کو کائنات کا ایک حقیر ذرہ ہی سمجھتے ہیں اور ان کا عقل کل ہونا یا خدا بنا کبھی گوارا نہیں کرتے، شاید اس لیے کہ وہ موت پر آدمی کا قابو پانا کسی طرح بھی تصور نہیں کر سکتے اور جب یہ بات ممکن نہیں تو وہ اس عارضی زندگی میں حیات بعد الموت پر زیادہ دیتے ہیں اور زندگی کو اعتدال اور سلیقے سے گزارنے کا درس دیتے ہیں۔

البتہ جب بھی وہ ہمیں نصیحت فرماتے ہیں اور موت کے اٹل ہونے کی بار بار یاد دلاتے ہیں تو بلاشبہ کچھ دیر کے لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی ساری جدوجہد اور تعمیر و تخلیق بے کار محض ہے۔ موت کے اٹل ہونے کے اقرار سے کسی کو نجات نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد انسان کی اصلاح کا ایک بڑا ذریعہ موت کی یاد دہانی سمجھتے ہیں یہ تصور آدمی کو فساد، حرص وآزاد اور دوسری ترغیبات بے ہودہ سے باز اور بلند رکھا سکتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریروں کے ذریعہ فکری جمود، تنگ نظری کے خلاف بڑی جرات اور بے باکی سے کام لیا ہے، انھوں نے مذہبی تعصبات، کینہ رسومات، جاہلانہ اعتقاد کی مذمت کی۔

ڈپٹی نذیر احمد نے تمام خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جو قومی ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ وہ فرد اور سماج کو ان تمام خصوصیات سے آراستہ کرنا چاہتے تھے جن کے بغیر کوئی قوم دنیا میں پنپ سکتی ہے اور نہ کسی قسم کا معاشرتی نظام قائم رہ سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"کوئی چیز ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ سے باہر نہیں ہو سکی۔"(۸)

ڈپٹی نذیر احمد جمود کی معاشرتی زندگی کے اہم مسائل اور متعدد پہلوان کی تحریروں میں سمائے ہوئے ہیں، ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے تحریروں میں اجتماعیت کو زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے اور انسانوں کے باہمی میل جول کو انسانی ارتقا کے لیے ضروری بتایا ہے۔

''سماج کی اس سے بہتر تنظیم کا نقشہ اور کہاں دیکھنے کو ملے گا تہذیب و تمدن کے اعلیٰ معیار کی تعریف اس ابتدائی دور میں پیش کرنے کی صلاحیت صرف نذیر احمد کا خاصہ تھا۔''(۹)

ج: ڈپٹی نذیر احمد کے عمومی اخلاقی تصورات

اٹھارہویں صدی میں یوروپین ممالک میں صنعتی انقلاب ہوا تو ساتھ ہی ساتھ چرچ اور گرجا گھروں کی مذہبی شخصیات اور پادری سماج نے مذہب کا غلط تصور پیش کئے اور مذہب پر اپنی جاگیرداری ثبت کی تو ادب نے ایک کروٹ لی اور خیالی مار وائی اور مابعد الطبعیاتی دل گرفتہ واقعات و قصص سے احتراز کرتے ہوئے زمینی حقائق سے عوام کو متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ یورپ کے اس نشاۃ ثانیہ کے عہد میں بہت سارے مفکرین، ناقدین اور فلسفیوں نے ادب کو بامقصد بنانے پر زور دیا۔

برصغیر بھی پوری طرح سے غلامی کا طوق پہن چکا تھا اور اس کی نکیل پر غیروں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ باشندگان ہند کی زندگی ان پر تنگ ہو چکی تھی اور جملہ شیعۂ زندگی میں آزادی ان سے چھن لی گئی تھی جس کی بنیاد پر یہاں کے لوگوں کا ذہنی سکون، دلی فرحت و مسرت اور انبساط غارت ہو چکا تھا۔ سماجی اور اخلاقی، تعلیمی حالات ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ ان کے سامنے نئے مسائل پہاڑ کی طرح حائل تھے۔ ایسے ہی پر آشوب حالات اور ملک و ملت کے لیے پریشان کن ماحول میں ادب وجود میں آتا ہے۔ کوئی قوم جب تنزل کا شکار ہوتی ہے تو اس کے اندر تعلیم کی طرف سے عدم توجہی بڑھ جاتی ہے۔ اخلاق و کردار کا فقدان ہر سو دکھائی دینے لگتا ہے، روح فرسا مراحل سے دوچار ہونے والی

زندگیوں کے حقائق کو بیان کرنے کے لیے یہ ادب منظر عام پر آیا اور یہاں کے مدبرین، مبلغین اور مصلحین قوم و ملت نے اپنے اپنے نہج اور طرز فکر سے سماج کو فال بنانے، خواب غفلت سے بیدار کرنے، اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے خود کفیل ہونے کا پیغام دیئے اور شعر سے متقاضی ہوئے کہ وہ مقصد کے لیے تخلیق کیے جائیں۔

اٹھارہویں صدی کے مصلحین اور ادبامیں اہم نام ڈپٹی نذیر احمد کا ہے۔ جنھوں نے اپنی دور رس نگاہ اور شعور و فن کو کام میں لاتے ہوئے اپنے تصور اخلاق کے ذریعے سماج میں اصلاح کا کام کیا۔ سماج کی اصلاح کے لیے نظموں کی شکل میں زمینی حقائق سے روشناس کرایا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے عمومی اخلاقی تصورات ذیل ہیں:

ا۔ درستی عقائد مذہبی/مذہبی جمود کی بازگشت

سماجی زندگی میں مذہب کا نمایاں مقام ہے، اخلاقی اقدار پر اس کی گہری چھاپ پڑتی ہے۔ سماج کی ذہنی نشو و نما میں مذہبی عقائد کا اہم حصہ ہوتا ہے، معاشرتی، سماجی زندگی مذہبی عقائد سے الگ نہیں ہوتی بلکہ ان میں ایک رشتہ ہوتا ہے۔ مذہب ایک ضابطہ حیات کا نام ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب کو مذموم رسم و رواج کی آمیزش سے کچھ اس طرح بنالیا کہ غیر مذہب کے لوگ اسلام پر نکتہ چنیاں کرنے لگے۔

ان کی نظر میں مسلمانوں کے غیر مہذب ہونے کا سبب خود ان کا مذہب ہے، جیسا کہ ایک انگریز نے کہا تھا۔

"ترک جب تک مذہب اسلام کو نہ چھوڑیں گے مہذب نہ ہوں گے کیوں کہ مذہب اسلام انسان کی تہذیب کا مانع قوی ہے۔"

فواد پاشا نے اس انگریز کے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحم دلی کو کمال کے درجہ پر پہنچانے والی ہیں مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادت کو اگلے زمانے میں مفید تھیں مگر حال کے زمانے میں مفر ہو گئی میں چھوڑنا چاہیے۔''

اسلام سے متعلق فواد پاشا کے جو خیالات ہیں یہ ہی خیالات ڈپٹی نذیر کے شعری مجموعے نظم بے نظیر میں جا بجا ملتے ہیں۔

رحم کر یا رب کہ اب امت ترے محبوب کی
اس کی حالت دم بدم ہونے بہت ابتر لگی (۱۰)

ڈپٹی نذیر احمد کے نزدیک وہ اعتقادات اور رسم ورواج جو دیگر مذاہب کے زیر اثر مذہب کا جزو ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کی جائے اور مذہب کی اصل روح کو سامنے لایا جائے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے مذہب کی اصل تعلیم کو ظاہر کرنے کے لیے تحقیق واستدلال کا سہارا لیا۔ مذہب پر بے جا تقلید کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ توہمات مشرک وبدعت مذہب کا جزو خاص تھے۔ بہت سے مذہبی مسائل و معاملات کی خرابیوں کو ڈپٹی نذیر احمد نے نمایاں کیا، تنگ نظر طبقہ مذہب کو درمیان میں لا کر جدید تعلیم وترقی سے بے زاری کا اظہار کر رہا تھا ڈپٹی نذیر احمد کو اپنے نظموں میں یہ بحث کرنی پڑی اور یہ بار بار بتانا پڑا کہ مذہب جدید تعلیم وترقی کا مخالف نہیں۔

تقلید اور روایت پرستی زندگی سے فرار کی صورت اور مذہبی تصورات میں جمود کی کیفیت پیدا کر رہی تھی، ڈپٹی نذیر احمد نے مذہب کا متحرک تصور پیدا کیا، اس کے مذہبی اور علمی اشعار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مذہبی

ظاہر داری، مذہبی تعصب اور تنگ نظری ایک فرقے کا دوسرے فرقے پر مناظرانہ حملے چند فقہی و فروعی مسائل تک مذہب کو محدود کر دیتا ہے مذہب کی تعلیم محدود نہیں۔

نچا مارا ہو یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اس اختلاف دین و مذہب کو (۱۱)

زمانے نے بہت سفاکیاں مذہب کی دیکھی ہیں
اگر شک ہو تو تم بھی آزما دیکھو مجرب کو (۱۲)

خدا محفوظ رکھے اس کی زد سے پروہ گولا ہے
نہ پیادے ہی کو چھوڑے اور نہ راکب کو نہ مرکب ہو (۱۳)

یہ وہ آتش ہے عالم سوز جس کی ایک چنگاری
جلا دے ایک دم میں خشک و تر کو دور اقرب کو (۱۴)

ڈسا ہو جس کو اس موذی نے وہ پھٹکا نہیں کھاتا
خدارا تم نہ چھو لینا کہیں اس نیش عقرب کو (۱۵)

ڈپٹی نذیر احمد کے اشعار کا بڑا حصہ علمی اور فلسفیانہ موضوعات پر مشتمل ہے تاہم مذہبی مضامین کی حیثیت ثانوی ہے۔ دراصل ان اشعار کا مقصد تہذیب و معاشرت اور تعلیم و تربیت کی اصلاح ہے مگر مذہبی مسائل زیر بحث کیے بغیر اصلاحی تصور اخلاق کو تقویت نہیں دی جا سکتی۔

مزاج اسلام کا ناساز ہو اچھا نہیں لگتا

کسی کا بولنا آواز سے جانِ معذّب کو (۱۶)

ڈپٹی نذیر احمد نے مذہبی جمود کی کیفیت کو توڑنے کے لیے اس طرف توجہ دی، اس تصور اخلاق کو روشن خیالی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں روایت اور قائم نظریے کے بجائے استدلال اور انفرادیت کے استعمال کی وکالت کی گئی اس مذہبی جمود کی بازگشت نے بہت ساری انسانی اصلاحات کیں جس میں عقل اور انسان دوستی پر بنیاد رکھی گئی۔ قدامت پسندانہ مذہبی نظریہ استحکام اور ایک دروں بینی اجتماعی نفسیات کے باوجود ہندوستان وہ سرزمین تھی جہاں مذہب کو برقرار رکھتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے مذہب کی تفہیم اور اس کی تاویل جاری رکھی۔ اپنی کاوشوں کے طفیل قدامت پسندانہ اسلام کی جانب سے سخت مخالفت کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے لیے گویا ایک دریچہ کھل گیا۔

۲۔ توہمات سے کنارہ کشی

جس چیز کا حقیقت میں وجود نہ ہو اس کا وجود یا جس میں خاص تاثر نہ ہو، اس میں خاص تاثر کا اعتقاد رکھنا توہم پرستی کہلاتا ہے۔ توہم پرستی کا مطلب خوف یا جہالت کی وجہ سے غیر عقلی عقائد پر یقین رکھنا ہے جیسے عوام میں پتھروں اور ستاروں کے موثر ہونے کا اعتقاد مشہور ہے اسی کو توہم پرستی کہتے ہیں۔ اسلام میں توہم پرستی کی قطعاً گنجائش نہیں مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی کثیر تعداد اس مرض کا شکار ہے۔ مسلمانوں میں توہم پرستی کی اہم وجہ کم علمی اور دینی احکام سے ناواقفیت ہے اور دوسری وجہ برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک ساتھ رہنا۔ توہم پرستی کی مثالیں ذیل ہیں۔ نومود کی نظر بد سے بچانے کے لیے کاجل، سرمہ کا نشان لگانا، شام کے وقت جھاڑو لگانے سے روکنا اس سے دولت میں کمی ہوتی ہے، مرد کی دائیں اور عورت کی بائیں آنکھ پھڑکنے کو اچھی خبر کی آمد سے مشروط کرنا، چارپائی پر بیٹھے ہوئی ٹانگیں لٹکی ہونے کی حالت میں ہلانے سے دولت کا ہاتھ سے نکل جانا، پیاز یا چھری سرہانے رکھنے سے بُرے

خوبوں سے نجات ملنا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، ٹوٹے ہوئے آئینے میں چہرہ دیکھنا، دودھ کا اُبل کر برتن سے باہر گر جانا، مغرب کے بعد گھر کی ساری بتیاں جلادینا ورنہ بدروحیں آجانے کا خدشہ، کانچ کا ٹوٹنا، بلی یا کتے کا رونا نحوست اور بے رکتی کی علامت سمجھی جاتی ہے، چھینک آئی تو کوئی یاد کر رہا ہے، دائیں ہاتھ میں خارش ہے تو دولت آئے گی بائیں میں ہے تو جائے گی، جھاڑو سیدھا کھڑا کرنا یا عصر بعد جھاڑو دینے کو نحوست خیال کرنا توہمات ہیں۔

ہندوستانی معاشرے میں توہم پرستی ایک اہم مسئلہ رہا ہے توہم پرستی سے مراد وہ رسومات جن کے کرنے سے زندگی میں خوشحالی آسکتی ہے۔ مثلاً ہندو نو رائدہ بچوں کی کنڈلی تیار کرتا ہے۔ اور مسلمانوں سیاروں کی گردش کا انسانی زندگی پر اثرانداز ہونا، شوہر کے مرنے پر بیوہ ہونا وغیرہ ہندو سماج کے کچھ اثرات مسلم سماج پر بھی پڑے مثلاً شب برات میں حلوہ کھانا، منت، قبروں پر چادر چڑھانا، اسی طرح خواب کی تعبیر ڈھونڈنا، ڈپٹی نذیر کے تصور اخلاق کا توہم پرستی کا عنصر ممنوع ہے وہ ہمیشہ دوٹوک بات کہتے ہیں حق کے اظہار میں کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیتے، شعری مجموعے نظم بے نظیر میں ہے کہ

مسلمانوں نے آپ اسلام کو ایسا بگاڑا تھا
کہ ہم اس کی بدولت آخر آ پہنچے ہیں اس حد کو (۱۷)

مسلمانوں کے ہاں توہم پرستی کثرت سے تھی جیسے مزار کے قریب درختوں کے نیچے بیٹھنا جس سے بہت سی خواہشات اور تمنائیں وابستہ کر لینا، اور مزار کے درختوں کے پھل سے فال نکالنا بہت ہی متبرک سمجھا جاتا، صحت کی بہتری بیماریوں کا علاج کے لیے کہا جاتا تھا۔

درختوں کے نیچے سونا منحوس سمجھنا، درختوں پر تعویذ لٹکانا، درخت کے نیچے بال کھولنا وغیرہ توہم پرستی کی مثالیں ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں کہ؛

خدا ہی جانے کیا اسلام کو لوگوں نے سمجھا تھا

پہلے آتے تھے سب مکذیب کو ابطال کو رد کو (۱۸)

ماہ صفر کے توہمات، ماہ صفر کو منحوس سمجھنااور اس کے بارے میں من گھڑت بدعت کا عام ہونا توہم پرست مسلمان کا خاصا تھا۔

نہ کچھ تخفیص مذہب کی نہ کچھ تعیں ملت کی

جو اسود کو وہ ابیض کو جو ابیض کو وہ اسود کو (۱۹)

۳۔ ماضی پرستی اور حال سے بے اعتنائی

مسلمانوں کی ماضی پرستی نے ان کو حال اور مستقبل سے غافل بنادیا تھااور وہ اصلاح و ترقی کے لیے کوششیں کرنے کے بجائے اس غلط فہمی میں زندگی گزار رہے تھے کہ وہ ترقی کی تمام منزلیں طے کر کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ گئے ہیں اور اب ان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ تمام علوم وفنون اور زندگی کے ہر ایک شعبے میں ان کے آباؤاجداد نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ اب مزید ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس لیے وہ ہر نئی چیز سے گریز کرنے لگے اور ترقی پذیر زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے کے بجائے لکیر کے فقیر بنے رہنے کو سب سے بڑی ترقی تصور کرنے لگے۔ اس طرح سوچ اور فکر نے مسلمانوں کو مزید دیگر مسائل سے دوچار ہونے پر مجبور کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اشعار کے ذریعے اس طرح کی سوچ دراصل قوم کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ اس نئی بات کو حقارت کی نظر سے اس کے فائدے سے محروم ہونے کے مترادف ہے لوگوں کے اعتراضوں کو سننے سے گریز کرنااس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی غلطیوں کو درست کرنے کے بجائے اس سے بے اعتنائی برتنا۔

ہائے وہ دور موافق کہ مسلمان کبھی

حشمت و سلطنت و یسر رکھتے تھے

فتح اک خادمہ تھی ان کی اور اقبال غلام

مختصر یہ ہے کہ پلے پہ خدا رکھتے تھے

پھر کیا نقص ہے جو ہم میں ہے اور ان میں نہ تھا

کون سا وصف وہ اپنے سوار رکھتے تھے(۲۰)

دین و دنیا کو برتتے تھے مگر عدل کے ساتھ

دونوں پلوں کو ترازو کے تُلا رکھتے تھے

طالب عزت دینا تھے فقط دین کے لیے

ورنہ دنیا کو وہ نظروں سے گزار رکھتے تھے (۲۱)

الٰہی دے مسلمانوں کو توفیق مسلمانی

کہ پھر آ جائے کشت مردہ اسلام میں پانی (۲۲)

۱۸۵۷ کے بعد مسلمانوں میں مذکورہ بالا باتیں عام تھیں ان خرابیوں سے مسلمان انتہائی پستی کا شکار ہو چکے تھے اور اس کو مقدر کا لکھا سمجھ کر زندگی گزار رہے تھے۔ قدامت پرستی نے مسلمانوں کو مزید زوال پذیر بنا دیا۔ وہ عمدہ اور اعلٰی اخلاق جو مذہب اسلام کی بدولت ہمیں ورثہ میں ملے تھے ہم اس سے کوسوں دور ہو چکے تھے اور صرف اپنے اجدار کے کارناموں پر فخر کرنا ایک شیوہ بن گیا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ان مندرجہ بالا اشعار کے ذریعے ماضی پرستی جیسی مہلک بیماری سے نکالا اور حال کی طرف رواں دواں کیا۔

۴۔ تعلیم کی اصلاح، انگریزی تعلیم کا رواج

معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لیے تعلیم بے حد ضروری ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے زمانے میں معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں تھی اس کی بنیادی وجہ علم سے دوری اور جاہلیت تھی۔ جو لوگ تعلیم یافتہ تھے ان کی تعلیم و تربیت اس قدر ناقص تھی کہ نہ تو وہ معاشرے کے لیے مفید بن سکتے اور نہ خود اپنی حالت درست کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ ناقص معلومات کی بناپر وہ معاشرے کے حق میں زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہے تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر مذہبی لوگوں پر مشتمل تھا اور معاشرے کی اصلاح میں ہمیشہ یہی لوگ سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا مندرجہ ذیل شعر تعلیمی اصلاح کی ضرورت کے لیے نمایاں ہے۔

اب وقت وہ نہیں ہے جو ہو چکے پہلے
بدلے ہوئے جہاں میں سارے معاملے ہیں(۲۳)

تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ایک اہم مسئلہ تھا انسان کو مذہب اور شائستہ بنانے کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ ترتیب کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اچھی تعلیم صرف کتابوں کے پڑھ لینے اور امتحان دینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے تربیت تعلیم کا اہم رکن ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد ایک اور شعر میں کہتے ہیں کہ:

اب بھی اگر عقل میں ہو کچھ اصلاح
مان لو یہ بے غرضانہ صلاح (۲۴)

علم ہمارا ہے بدتر جہل سے
اور بھی کچھ ہونا ہوتا اہل سے(۲۵)

ڈپٹی نذیر احمد کے عہد میں مسلمانوں کی سماجی حالت نہایت کسمپری کی تھی مال واسباب لٹ جانے کی وجہ سے لوگ صابر وشاکر انداز میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے تھے ایسے مایوسی کی حالت میں ڈپٹی نذیر احمد نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے زندگی کی بہتر بنانے کی تلقین کی۔ ان کے مطابق انگریزی تعلیم حاصل کر کے مسلمان سرکاری نوکری حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی مالی حالت کو خود کفیل بنا سکتے ہیں اس سے کچھ حد تک مسلمانوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج چل پڑا۔ انگریزی تعلیم کی اہمیت وافادیت ظاہر کرنے کے لیے ان کے شعر ملاحظہ ہو۔

یورپ نے خشک و ترکو دنیا کے کھوند مارا
ان کی ہی جہتیں ہیں ان کے ہی حوصلے ہیں (۲۶)

اس دور کے مسلمان انگریزی زبان سے نفرت کرتے تھے مسلمانوں کا بڑا طبقہ انگریزی پڑھنے کو اسلام کے خلاف سمجھتا تھا۔

کل آدمی میں کندن گر علم و معرفت ہے
اور یہ نہیں تو یارو مٹی کے سب ڈبے ہیں (۲۷)

۵۔ جدید سائنسی تعلیم کی ضرورت واہمیت

قدیم مروجہ تعلیمی نظام میں تبدیلی لانے کے لیے ڈپٹی نذیر احمد نے مختلف طریقہ کار اپنائے اور جدید تعلیم کی افادیت سے مسلمانوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی۔ محض جذبات سے کام لینے کے بجائے عقل وشعور سے کام لے کر تعلیمی نظام میں تبدیلی کو ناگزیر بتایا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اشعار میں سخت الفاظ بھی استعمال کیے جس کا مقصد قوم کی بے حسی پر ضرب کاری لگانا اور ذہنی جمود کو توڑنا تھا۔

دل ہے یا معیت کا پشتارا
ایک پونجی ہے وہ بھی ناکارہ (۲۸)

دوسرے لوگوں سے شکایت نہیں
ہم کو خود اپنی رعایت نہیں (۲۹)

اب بھی اگر عقل میں ہو کچھ صلاح
مان لو یہ بے غرضانہ صلاح (۳۰)

انیسویں صدی قدروں کی شکست وریخت کا زمانہ تھی تہذیبی اور سماجی نظام حیات میں غیر شعوری طور سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔خالص مشرقی اقدار کے امین و پاسدار قدیم مشرقی علوم و فنون کی بقا اور احیا کی طرف متوجہ تھے جدید طرز فکر کے علم جدید تعلیمی ڈگر پر گامزن رہنا چاہتے تھے۔ڈپٹی نذیر احمد نے اس نظریاتی جنگ میں حصہ لیا اور اپنے تعلیمی مشن کی اشاعت میں سر گرم عمل رہے۔

تعلیم سے متعلق ڈپٹی نذیر احمد کے ذہن میں ایک ایسا خاکہ تھا جو ہماری قدیم تعلیم سے بالکل مختلف تھا،اس میں بار بار جن چیزوں کی طرف زور دیا گیا وہ جدید تعلیم کی اشاعت اور اس کی ترقی کے لیے کوشش تھی۔

جدید علوم وفنون سے روشناس ہو کر زراعت صنعت و حرفت و تجارت میں ترقی کے مختلف ذرائع و وسائل پیدا ہوتے ہیں تعلیم و معاشرت کے تنزل میں جہالت ،افلاس و ناداری کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تجارت سے غیر ملکیوں کو فائدے حاصل ہو رہے تھے اور ہندوستانی اپنی ناواقفیت اور نااہلی کے سبب فوائد سے محروم تھے۔ڈپٹی نذیر احمد نظم بے نظیر میں کہتے ہیں کہ

اگرچہ علم بہ از جبل ہے زبان زرد خلق
مگر مراد مری علم سے ہے علم مفید
بس ایک کسوٹی پہ کس لو علوم کو اپنے
کہ اک نگاہ میں ہو منکشف سیاہ و سفید (۳۱)

ثبوت بین سے سائنس کے تفوق کا
ہیں ریل و تار کے دو معجزے پلا تردید
یہ سب نتائج تعلیم علم نافع ہیں
وگرنہ کون سا ایسا ہے ان میں وصنف مزید
ہے ان کو علم کا بل کس میں اتنی طاقت ہے
کہ ان کے ہاتھ میں سے نرم مثل موم جدید (۳۲)

سائنسی ترقی، صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے ٹیکنکل ادارے میں پڑھنا ضروری قرار دیا جس سے فرد مختلف صنعت و حرفت کا علم حاصل کر سکیں اور معاشی صورت پر توانا ہو سکیں۔ ریاستوں میں ہنروں اور سڑکوں کی تعمیر کا بندوبست کیا جائے، کشت کاری کے نئے فنون کی طرف نئے اقدام ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اشعار یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ جدید تعلیم ہی قوم کی سماجی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو گی۔

لیکن مراد علم سے علم جدید ہے
یورپ میں جس سے رونق کل من مزید ہے
ثروت کی سلطنت کی یہی اک کلید ہے
یہ ہو تو پھر تمام زمین زر خرید ہے
یہ علم گر نہیں ہے تو فضل و کمال ہیچ
منشی ادیب شاعر شیریں مقال ہیچ
داب مناظرات و جواب و سوال ہیچ
تحقیق میر زاہد و ملا جلال ہیچ (۳۳)

کوشش کرو تو غیب سے ہوں حاجتیں روا
بے جہد کے کسی کو کبھی کچھ نہیں ملا

ہم کو توقعات نہ رکھنے کی وجہ کیا
یورپ نے کچھ خدائی کا ٹھیکہ نہیں کیا (۳۴)

۶۔ عورتوں کی حالت زار اور امور خانہ داری

۱۸۵۷ء میں جاگیرداروں اور نوابوں کی جائیدادیں لٹ جانے سے اور مردوں کے قتل ہو جانے سے کئی عورتیں بیوہ ہوگئیں تھیں۔ جو شریف خواتین کبھی اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں گئی تھیں انہیں روزی روٹی کے لیے دوسروں کے یہاں کام پر جانے کی نوبت آگئی تھی وہ عورتیں اپنی عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنا دشوار سمجھتی تھیں ان کی حالت ایسی مجبور اور بے بس انسان کے مانند تھی جو ساری تکلیف سہہ کر خاموش رہتا ہے کچھ مسلم امیر و امراء جو انگریزوں کے مخبر بن گئے تھے وہ بھی ایسی بے کس عورتوں کا استحصال کرتے تھے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کئی خواتین نے اس بے رحمی کی زندگی سے چھٹکارا پانے کے لیے موت کو گلے لگالیا یہ ایسا دور تھا جس نے عورتوں پر قیامت ڈھائی تھی۔

زمینداروں اور نوابوں کے ساتھ ساتھ انگریز عہدیداروں نے بھی اس دور میں عورتوں پر مظالم کیے، اس دور میں عورتوں کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہوگئی تھی۔ امور خانہ داری پر بحث ذیل ہے۔

انسانی سماج مین تہذیب و تمدن اور ثقافت کو کافی اہمیت حاصل ہے، انسانی سماج مرد اور عورت دونوں پر مشتمل ہے اور انھیں دونوں کے مشترکہ افعال و اعمال سے تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ تہذیب و معاشرت ایک منظم اجتماعی زندگی کا نام ہے۔

جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا سماج میں تبدیلی آتی گئی، مردوں کا کام معاشی ذرائع تلاش کرنا اور اپنے افراد خاندان کی کفالت کرنا طے پایا ان تمام ذمہ داریوں میں امور خانہ داری سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے۔

امور خانہ داری سے مراد وہ فرائض ہیں جو ایک صالح معاشرے کی تعمیر میں اہم اور اول کردار ادا کرتے ہیں، آنے والی نسلیں اپنی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہیں اگر ایک ماں کا رویہ اپنے افراد خاندان سے جس قدر مانوس و مربوط ہوگا اس کا اثر اس کی اولاد پر پڑے گا۔

ایک تہذیب یافتہ معاشرے میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں خاص طور پر ماں باپ اور دیگر افراد کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک، ان کا ادب و احترام بزرگوں کی خدمت اور سبھی افراد خاندان سے مل جل کر رہنے کا طریقہ کار ضروری ہو جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلم معاشرے میں بکھراؤ سا آگیا، عورتیں ظلم کا شکار ہو گئی تھیں اور نفسیاتی طور پر احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھیں وہ خود کو بے سہارا و غیر محفوظ سمجھتی تھیں۔ایسے حالات میں امور خانہ داری کی ذمہ داری سے وہ دور ہوتے دکھائی دے رہی تھیں۔ کئی متوسط گھرانے کی خاتون بے بسی و بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ عورتوں کے اس ذہنی رجحان اور احساس کمتری کو دور کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے دور کے حالات کا مشاہدہ کیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس زمانے کی عورتیں جن مسائل سے گزر رہی ہے ان کا اثر اپنی لڑکیوں پر پڑے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کی ذمہ داری اور امور خانہ داری پر بحث کی۔ خاص طور پر عورتوں میں جہالت کو ختم کرنا، اسلامی شعار کے متعلق زندگی گزارنا، بزرگوں اور افراد خاندان کی عزت کرنا، ان کی خدمت گزاری کو اہم سمجھا، ان جیسی باتوں کو موضوع بنایا، نظم بے نظیر کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

امن و فراغ و عافیت و راحت و قرار
نام و نمود و عزت و توقیر و اعتبار
حُسن معاشرت کہ تمدن کا ہے مدار
اور جس سے بے نیاز نہیں کوئی خانہ دار (۳۵)

۷۔ کثیر ازدواجی صورت حال

ڈپٹی نذیر احمد کے عہد میں مسلم معاشرے میں ایک سے زائد شادیاں کرنے کا رواج عام تھا اس کی وجہ سے ایک تو مذہب اور دوسرا دولت کی فروانی، مذہب اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی۔ اس کو مردوں نے اپنے حق میں گردانا اور ایک سے زائد شادیوں کا رواج عام ہو تا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد خود عالم تھے اور دینی مسائل سے واقف بھی تھے اس زمانے میں ایسے اہم اور نازک مسائل پر قلم اٹھانے کی جرات بڑے بڑے عالم دین بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے مذہب کے واضح حکم اور اجازت کے خلاف اپنے نکتہ نظر کی پر زور تائید کی، عقد ثانی کی شرعی اجازت کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد لکھتے تھے کہ ''مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں آزادی دو بہت بڑے نقص میں ایک نقص رفع کرنے کے لیے تحریریں لکھیں ہیں تو دوسرے نقص کی دفاع میں بھی کچھ کرنا ضروری ہے۔''

ڈپٹی نذیر احمد سمجھتے تھے کہ ایک سے زائد شادیاں کرنے سے گھریلو توازن بگڑ جاتا ہے ایک مرد چار بیویوں کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہا ہے۔ چاروں بیویوں کی خواہشات ان کی ضروریات اور کفالت پوری کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی بیویوں میں رسہ کشی تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی اولاد کی تربیت بھی متاثر ہوتی ہے۔

چاروں بیویاں کبھی کبھی اپنی سوتیلی اولادوں سے بے اعتنائی برتتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد دوسری شادی کرنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

غالب صفت تھی ان کی خشونت بائی حال
اس طرز میں شریک تھے کیا اہل کیا عیال
وہ خانہ داریاں تھیں بجائے خووش و بال
اک مرد جتنی عورتیں چاہے کرلے حلال
منکوحہ چھوٹ جاتی تھی عذر نحیف پر
نزلہ گراہی کرتا ہے عفو صنعف پر (۳۶)

ناگفتہ بہ ہے ان کا طریق معاشرت
شرم و حیا سے ان کو نہ تھی کچھ مناسبت
کرہا زنان بیوہ کی ارث و مقاسمت
دو بہنیں اور حقوق زنی میں مشارکت (۳۷)

۸۔ وکٹورین تصور اخلاق کی حمایت، برصغیر کی تہذیبی انفعالیت کو وکٹوریائی اخلاقی اقدار سے بدلنا

وکٹورین دور ۱۸۳۷ سے لے کر ۱۹۰۱ تک کا دور ہے۔ اس برطانوی دور میں ملکہ وکٹوریہ نے کرداری اور اخلاقی اقدار و معیار کو بحال کیا ہے۔ وکٹورین تصور اخلاق میں تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سفید باشندوں نے سیاہ فاموں کا جس قدر استحصال کیا، جس قدر نسلی تعصب پروان چڑھا وکٹورین تصور اخلاق میں ممنوع کیا گیا۔

وکٹورین نظریہ اخلاق کے پس پردہ جو حکمت عملی تھی اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جاگیرداری نظام کی وجہ سے معاشرے میں جو بدحالی، غربت افلاس غیر متعصبانہ رویوں نے جنم لیا وہ کس طرح اعتدال، مساوات و برابری پر لایا جاسکے گا۔

وکٹورین دور کو مسلسل تبدیلیاں رونما ہونے کا دور اور زندگی کے ہر میدان میں ترقی کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں مادی ترقی، سائنسی بیداری، جمہوری اصلاحات، صنعتی اور میکانکی ترقی ہوئیں۔ ڈپٹی نذیر احمد وکٹورین تصور اخلاق کی حمایت میں مجموعہ نظم بے نظیر میں کہتے ہیں کہ

ملکہ کو دعائیں دو دل سے
کہ رہیں تا بدیر عالم میں
آفتاب ان کے عدل کا تاباں
جیسے یورپ میں ویسے پچھم میں (۳۸)

ملکہ وکٹوریہ نے اپنے وضع کردہ تصور اخلاق سے جذباتیت کو ابھارا، عوام سے متعلقہ گرد و پیش مسائل کو حل کیا اور مایوسی اور دکھ کے برعکس امید کی کرن کو رونما کیا۔

عوام میں نشاط انگیز ہنگامی کیفیت کے پیش نظر ملکہ وکٹوریہ اپنے تصور اخلاق کے ذریعے تجزبہ کار مہم بنا کر معاشرے کے مسائل کا حل تلاش کرتیں ہیں۔ ان کے اس تصور اخلاق میں بچپن کے غم اور دکھ کی بازگشت کے ساتھ

ساتھ جرائم پیشہ افراد یعنی کہ جیب کترے اور ان کے رفیق جرم اور دیگر مجرمانہ کرداروں کے خلاف بغاوت کا عنصر جاری رکھتی ہیں۔

ملکہ وکٹوریہ اپنے وضع کردہ تصور اخلاق کے ذریعے اقتصادی مسائل کا شکار برے گمراہ قیدیوں اور خود غرض عوامی اداروں کے درمیان تعلق کا معائنہ کرتیں ہیں اور ان کا حل تلاش کرتیں ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ قیدیوں کی تلخ اور دکھ بھری زندگی میں امید کی کرن اور زندگی گزارنے کی رمق پیدا کرتیں ہیں۔

ملکہ وکٹوریہ قید خانوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ قیدیوں کے لیے اتوار کا دن مذہبی امور کے لیے مختص کرتیں ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ تصور اخلاق کے ذریعے معاشرتی اونچ نیچ کی بازگشت کا اعلان کرتیں ہیں اور ساتھ ساتھ ناجائز عدالتی قوانین اور عدالت پر طنز کے ساتھ ساتھ عدالتوں کی فیصلوں میں تاخیر اور غیر منصفانہ فیصلوں پر نکات زیر بحث لاتیں ہیں۔

ملکہ وکٹوریہ اپنے وضع کردہ تصور اخلاق کے ذریعے انسانی تشدد کی روک تھام کرتیں ہیں، فیکٹریوں میں بچوں اور بالغوں کو پنجروں میں بند کر دیا جاتا تھا ذاتی آزادی میسر نہ تھی، ملکہ وکٹوریہ نے ان اندوہناک حقائق کی روک تھام کی اور کہا کہ مشینوں سے زیادہ کو کارکنوں سے زیادہ وقعت نہیں دی جائے گی لوگ مشینوں سے بڑے ہیں اور وہ مشین خود بناتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد مجموعہ نظم بے نظیر میں کہتے ہیں کہ

جتنی انگریزی رعایا سے سبھی خوش حال ہے
ہم بھی سایہ وکٹوریا کہنے کو ہیں (۳۹)

وکٹورین اخلاقی اقدار میں تحمل اور وقار کے نئے زاویے تشکیل دیئے گئے، نئے تصور اخلاق میں انسانی سمگلنگ کو بین کیا گیا اور غلامی کے خاتمے کی مہم چلائی گی۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے عہد میں جانوروں کے ساتھ ظلم کی روک تھام اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے قانون سازی متعارف کروائی۔ میٹروپولیٹن پولیس کو متعارف کروایا جس کا مقصد

جانوروں پر ظلم کی روک تھام تھا مثلا لوگ جانوروں کی ہار جیت کے مقابلے کرواتے لطف اٹھاتے، میٹروپولیٹن پولیس نے ممنوع قرار دیا۔

ملکہ وکٹوریہ نے ہم جنس کا خاتمہ کیا اور غیر قانونی قرار دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ جسم فروشی کو بھی بڑی برائی قرار دیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے جنسی جبر، جنسی تشدد کے خلاف جنگ جاری کی جس سے حقوق نسواں متعارف ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مندرجہ بالا تصور اخلاق کو مدنظر رکھتے ہوئے ملکہ وکٹوریہ کے اخلاقی اقدار کی حمایت کی اور برصغیر کی تہذیبی انعالیت کو انہی وکٹوریائی اخلاقی اقدار سے بدلنے کی کوشش کی۔

ڈپٹی نذیر احمد ملکہ وکٹوریہ کے اخلاقی اقدار سے متاثر ہو کر مجموعہ نظم بے نظیر میں لکھتے ہیں کہ

ہمیں پناہ ہے وکٹوریہ کی شفقت کی
ہم اس کے بچے وہ ہم سب کی مہربان مادر (۴۰)

حوالہ جات

۱۔ محمد حبیب الرحمن، ''اسلامی اخلاق'' لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۲۴

۲۔ امیر سینائی لکھنوی ''امیر اللغات'' لاہور، مقبول اکیڈمی، حصہ اول، ۱۹۸۸ء، ص ۹۸

۳۔ نسیم اللغات (اردو) مرتبین: سید مرتضی فاضل لکھنوی، سید قاسم نسیم امروہوی، لاہور، غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹، ص ۵۸

۴۔ آکسفورد انگلش اردو ڈکشنری، مرتب ومترجم: شان الحق حقی، کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء، ص ۵۳۳

۵۔ سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، لاہور، الفصیل ناشران، س ن، ص ۱۲۶

۶۔ نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۵۰

۷۔ ایضاً

۸۔ مقالات سرسید سے مضامین رشید تک مؤلف فخر اسلام، اعظمی ص ۴۶

۹۔ ایضاً

۱۰۔ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، نظم بے نظیر، ص ۳۰

۱۱۔ مجموعہ بے نظیر، ص ۸۲

۱۲۔ نظم بے نظیر، ص ۸۲

۱۳۔ نظم بے نظیر، ص ۸۲

۱۴۔ نظم بے نظیر، ص ۸۲

۱۵۔ نظم بے نظیر، ص ۸۲

۱۶۔ نظم بے نظیر، ص ۸۲

۱۷۔ نظم بے نظیر، ص ۸۴

۱۸۔ نظم بے نظیر، ص ۸۴

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۹۶

۲۱۔ نظم بے نظیر، ص ۹۶

۲۲۔ نظم بے نظیر، ص ۱۳۴

۲۳۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۱۳۸

۲۴۔ نظم بے نظیر، ص ۲۹

۲۵۔ نظم بے نظیر، ص ۲۸

۲۶۔ نظم بے نظیر، ص ۱۳۸

۲۷۔ نظم بے نظیر، ص ۱۳۸

۲۸۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۲۳

۲۹۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۲۸

۳۰۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۲۹

۳۱۔ نظم بے نظیر، ص ۱۶۳

۳۲۔ نظم بے نظیر، ص ۱۶۴

۳۳۔ نظم بے نظیر، ص ۱۷۷

۳۴۔ نظم بے نظیر، ص ۱۷۸

۳۵۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۱۸۴

۳۶۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۱۸۱

۳۷۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۱۸۱

۳۸۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۱۰۱

۳۹۔ مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۹۰

۴۰۔ نظم بے نظیر، ص ۱۸۲

محاکمہ

ڈپٹی نذیر احمد کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اگر ان کی شناخت صرف نثر نگار کی حیثیت سے کی جائے تو ان کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ ڈپٹی نذیر احمد جہاں نثر نگاری کی مسند عظیم پر متمکن ہیں وہیں بطور شاعر ایک راہبر بھی ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مایہ ناز خطیب و مقرر بھی تھے۔ زبان و قلم ہدیہ زبانی سے ہر کسی کو یہ دونوں نعمتیں میسر نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی قلم کار یا تاجدار ہے تو وہ زبان سے محروم ہے اور اگر کسی کی زبان میں جادو بیانی ہے تو وہ قلم سے بے گانہ، لیکن ڈپٹی نذیر احمد کو فطرتاً یہ دونوں نعمتیں عطا ہوئی تھیں۔ قلم کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی زبان اور زور بیان سے بہت سارے اصلاحی، سماجی اور اخلاقی کام کیے۔ یہ قوتیں خداداد تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کا زمانہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اتھل پتھل کا شکار تھا۔ اخلاقی اقدار کی تنزلی آٹھ سو سالہ مسلمانوں کی تہذیبی وراثت یعنی مغل شان و شوکت چراغ سحری ثابت ہو رہی تھیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مجموعہ کلام نظم بے نظیر میں زیادہ تر اصلاحی نظمیں شامل ہی جو گاہے گاہے اصلاحِ معاشرہ کی غرض سے کہی گئیں۔ ڈپٹی نذیر احمد چونکہ اصلاحی تحریک سے منسلک تھے ایسے پر آشوب حالات میں قدرت کی طرف سے عطا کردہ اپنے زور بیان کو استعمال میں لاتے ہوئے جابجا خطاب اور لیکچرز دیے، دراصل ڈپٹی نذیر احمد کی تمام و کمال نظمیں ان کے نظریات اور لیکچروں کا تتمہ ہیں۔ وہ تقریروں میں زور پیدا کرنے کے لیے نظمیں سناتے، نظموں کی تشریح و تفسیر کرنے کے لیے پھر تقریر کرتے۔ ان نظموں میں بلند آہنگی خیالات میں جوش و خروش وار تسلسل و ربط کی کیفیت ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی شاعری میں ان کے لیکچر کا عکس نمایاں دیکھا جاسکتا ہے، جس طریقے سے اصلاح معاشرہ اور دیگر اصلاحی تحریکوں کے مقاصد ان کی نثری تصانیف میں نظر آتے ہیں، جابجا شاعری میں بھی اس کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے نظم بے نظیر ادب سے زیادہ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اصطلاحات کا مرصع نظر آتی ہے۔ مجموعہ نظم بے نظیر کے اسلوبیاتی پہلو پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے جس بے تکلف انداز تحریر سے قاری کے ساتھ رفاقت کا رشتہ استوار کیا ہے اسے ان کی اسلوب کی خوبی قرار دیا جاسکتا ہے، اس میں ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کا بڑا عمل دخل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی زبان کو ایک طرف دلی کی بیگماتی زبان کہا گیا تو دوسری طرف انہیں محاورات کا بادشاہ۔ مجموعہ نظم بے نظیر میں بے تکلف گفتگو کا رنگ نمایاں ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے زبان میں زور مرزہ اور محاورے استعمال کیے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے مجموعہ نظم بے نظیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وسعت و گہرائی اور مشاہدے کی پختگی پائی جاتی ہے، انہوں نے نظم بے نظیر میں جابجا ایسے نکات پیش کیے ہیں جن سے محاکات کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے بڑی ہی چابکدستی کے ساتھ عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے شعری مجموعے میں سنجیدگی پر شوخی اور لطافت پر پیچیدگی اور ابہام پر وضاحت کو اور بے راہ روی پر ترتیب و تنظیم کو ترجیح دی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے حالات کے تقاضے کے تحت مبالغہ آرائی سے پرہیز برتا اور شگفتہ بیانی سے کام لیا۔ یہ خوبیاں صرف حالات، ماحول اور موضوع کا نہیں بلکہ ان کی اپنی طبیعت کا بھی تقاضہ تھیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ابتدائی تحریروں میں زور اور وزن پیدا کرنے کے لیے مبالغہ آرائی اور قافیہ پیمائی کا انداز اختیار کیا لیکن اس روش پر تادیر قائم نہ رہ سکے، جیسے جیسے حالات میں سنگینی آتی گئی ویسے ان کے اسلوب میں توانائی اور سادگی آتی گئی۔ لفظوں کے اختیار و انتخاب میں بڑی چابکدستی اور ہوشیاری سے کام لیا۔ سیاسی و سماجی حالات کے پیش

نظر شخصیت میں ٹھہراؤ آیا تو اسلوب و آہنگ پر بھی اس کا اثر پڑا جس سے تحریریں جذباتی سے زیادہ منطقی اور استدلالی ہو گئیں۔

ڈپٹی نذیر احمد بسا اوقات پر لطف واقعات کے ذریعے اور کبھی محض ایک دو باتوں کے وسیلے سے نہ صرف قہقہوں کا جہاں آباد کرنے میں کامیاب ہوتے بلکہ چپکے سے سماج کی دکھتی ہوئی رگ اور رستے ہوئے ناسور پر نشتر زنی بھی کرتے۔ پیکر تراشی بھی نذیر احمد کے اسلوب کی اہم خصوصیت ہے جس کا خاص سبب موزوں ترین الفاظ کا انتخاب ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں ہر طرح کی تشبیہات کی فراوانی ہے۔ ان تشبیہوں میں ان کی مخصوص پُر مذاق اور شوخ طبیعت کا عکس صاف طور پر جھلکتا ہے، ان کے ہاں استعارے نسبتاً کم پائے جاتے ہیں۔ تشبیہات کے توسط سے نذیر احمد نے نہ صرف یہ کہ خوبصورت پیکر اچھالے ہیں بلکہ بعض پھبتیاں بھی کی ہیں۔

نظم بے نظیر میں جامعیت کا حسن، معنویت کی گہرائی و گیرائی اور جدت کی تازگی پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد منشاو مطلب کے اظہار میں ابہام پر وضاحت کو ترجیح دیتے ہیں۔ مجموعہ نظم بے نظیر میں ڈپٹی نذیر احمد کے زور خطابت کے رنگ سے خالی نہیں۔ بطور مجموعی اسلوب میں ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کے تمام پہلو اسلوب کے قالب میں ڈھل کر ان کے اصلاحی رویوں کی مقبولیت کے ضامن ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد لفظوں کے مزاج سے پوری طرح واقف تھے اور ان کی انفرادی قدر و قیمت سے آشنا تھے، اس لیے الفاظ کے اخذ و انتخاب میں تشبیہات و استعارات کے وضع کرنے اور پیکر تراشی میں اپنی بے پناہ ذہانت اور مہارت تامہ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اسلوب میں شگفتگی اور رعنائی پیدا کرنے کے لیے شوخی و ظرافت اور لطیفوں سے بھرپور کام لیا ہے جس کی وجہ سے بلا تامل ان کے اسلوب کو عوامی زبان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی نظمیں حالی کے تتبع میں ہیں اور اصلاح مسلم معاشرہ کا مقصد لیے ہوئے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کے عہد میں شمالی ہند میں تعلیم یافتہ مسلمانوں میں تین دھارے نظر آتے ہیں، پہلا طبقہ ماضی پرستی اور مذہبی تجدید کا حامی تھا، دوسرا طبقہ انگریزوں کی اندھی تقلید کا موئد تھا، تیسرا طبقہ مذہب کا دامن پکڑے ہوئے مغربی علوم کی برکات سے بہرہ ور ہونا چاہتا تھا۔ڈپٹی نذیر احمد اسی طبقہ کے سر خیل تھے۔

ہندوستانی خطہ تاریخی اعتبار سے زمانہ قدیم سے ہی دنیاء عالم کے مختلف اقوام کا مرکز بنتا آرہا ہے۔ وقت کے مختلف دورانیوں میں دنیا کے مختلف خطوں سے مختلف اقوام یہاں آکر آباد ہوتے رہے ہیں۔ مختلف حوالوں کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اہل عرب کا ہندوستانی خطہ سے واسطہ ، راستہ و تجارتی اغراض و مقاصد کے تحت زمانہ قدیم سے وجود میں آچکا تھا

اگر ہم مسلم معاشرے، مسلم دور حکومت، مسلم سلطنت کا تاریخی تناظر میں عروج وزوال کا جائزہ لیں اور ان کے مختلف اسباب تلاش کریں وتو جو خاکہ سامنے آتا ہے وہ ہی وجوہات ہندوستان میں بھی مسلم سلطنت کے عروج و زوال کی وجہ بنتی ہیں۔

نظم بے نظیر میں مسلم معاشرے بطور خاص ہندوستان میں مسلم معاشرے کے زوال کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ نظم میں ہندوستان مسلم معاشرہ کا ربط پوری عالم اسلام سے دکھایا گیا ہے۔اس کے اندر مسلم قوم کے مکمل عروج وزوال کی داستان رقم ہے کہ کس طرح دنیا میں مسلم سلطنت کا آغاز ہوا۔ معاشرہ کے وہ تمام تشکیلی عناصر کہ جن کی بنیاد پر ایک اسلامی ریاست نے فروغ پایا تھا، ان کا ذکر بہت خوبصورت انداز میں نظم بے نظیر میں کیا گیا ہے۔

نظم کے اندر مسلم معاشرہ کی دو نسلوں ایک وہ جو ابتدائی نسل تھی اور ایک نذیر احمد کے عہد کی نسل کا ڈپٹی نذیر تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ان دونوں میں جو فرق سامنے آتا ہے اسی کو بنیاد بنا کر پھر وہ تمام ہندوستانی مسلم معاشرہ

، تہذیب، ثقافت کے زوال کے اسباب تلاش کرتے ہیں اور ایک بار پھر سے ہندوستان میں مسلم سیاسی و ثقافتی احیاء کی بحالی اور تشکیل نوع کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف نظریات و سوچوں سے منتشر اور فرد فرد معاشرہ کو کسی خاص مرکز پر اکٹھا کرنا، بکھری ہوئی مسلم قوم کو اتحاد کی طرف لے آنا، داخلی طور پر فرد کے اندر ان وجوہات کہ جو تنزلی کا باعث بنی ہیں، ان کی نشاندہی کرنا ہے۔ پھر ان وجوہات کے خاتمے کی طرف آتا ہے، پھر جب فرد ان وجوہات کی نشاندہی سے آگاہ ہو جاتا ہے تو اس کے بعد وہ موجودہ عہد میں مسلم مقام و معاشرہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور بعد میں حال سے مستقبل کی طرف سفر کر کے اور دوبارہ سے اصلاحِ معاشرہ کے تحت ترقی کی منازل طے کرتے ہیں

دراصل تحریک علی گڑھ (سرسید احمد ورفقاء) کے جو مسلم قوم کی ترویج و ترقی کے لیے اغراض و مقاصد ہیں اس کے جو تہذیبی و ثقافتی پہلو ہیں، جس طرح کا معاشرہ علی گڑھ تحریک تخلیق کرنے کی کوشش کرتی ہے بالکل اسی طرح ہی نظمِ بے نظیر میں اس معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ زوال کے تمام تر اسباب و وجوہات بیان کی گئی ہیں اور پھر ان خصوصیات جو کہ سبب بنی ہیں معاشرے کی ابتری کا ان کو ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے نظمِ بے نظیر کے اغراض و مقاصد بھی علی گڑھ تحریک کا ایک حصہ نظر آتے ہیں۔

الغرض نظمِ بے نظیر ہندوستان میں مسلم معاشرے کے آغاز و ارتقا سے لے کر ان کے زوال اور پھر تشکیل نوع کا مکمل خاکہ نظر آتا ہے قومی و ملی غیرت کے تحت اسلامی معاشرہ کے احیاء پر زور دیتی ہے۔

مجموعہ نظمِ بے نظیر اپنے عہد کے بدلتے ادبی منظر نامہ کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ ہر عہد کا ادب اپنے سیاسی و سماجی محرکات و تہذیبی صورت کا عکاس ہوتا ہے، کسی بھی خطہ کے ادب کو اس خطہ کے سماج اور سماجی ذمہ داروں کی ادائیگی سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ تخلیق ہونے والے ادب کی جڑیں اس خطے کے معاملات میں پیوست ہوتی ہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مجموعہ نظمِ بے نظیر ہند اسلامی تہذیب کا عکاس ہے۔

نظم بے نظیر میں الجھے ہوئے معاملات و مسائل کے حل کے لیے تشکیل نوع کے لیے ماضی کی طرف رجوع کر کے دیکھا گیا ہے، حال کے تمام مسائل کا حل کوئی نئے نظام کی صورت میں سامنے نہیں لایا گیا بلکہ ایہائے کی صورت میں ماضی کو ہی مقدم رکھا گیا ہے۔اس کی بنیادی وجوہات اگر تلاش کی جائیں تو یہ بات حقیقی معنوں میں سامنے آتی ہے کہ امت مسلمہ کی ابتداء اور ابتدائی نظام بہت ہی جاندار رہا ہے، ہر طرف ایثار و قربانی کے جذبات، حب وطنی و بہادری کی داستانیں، فتوحات کا سلسلہ، تو اس طرح ابتدائی صورت میں بہت جلد ہی مسلم قوم نے ایک مثالی نمونہ پیش کیا تھا کہ جو بعد کے ادوار میں سامنے نہیں آسکا۔

اس لیے مجموعہ نظم بے نظیر میں مسلم (ہند) قوم کی بدحالی، شکست کی وجوہات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ تمام وجوہات تلاش کی گئی ہیں۔اس لحاظ سے ڈپٹی نذیر احمد نے مسلم قوم کی پامالی کی اخلاقی اقدار کے کھو جانے کو قرار دیا۔

گنوائی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

(اقبال)

المختصر ڈپٹی نذیر احمد نے مقصدی ادب کے تناظر میں نظم بے نظیر تخلیق کی کہ جس میں ہند اسلامی تہذیب کی بحالی پر زور دیا گیا ہے۔پچھلی نسلوں کے کارنامے سنائے گئے ہیں، موجودہ نسل کا تقابلی جائزہ و موازنہ کیا گیا ہے۔اس طرح درمیانے فرق کو بنیاد بنا کر وجوہات کو اسلاف کی پیروی نہ کرنے اور قومی (مسلم) خودداری کو گوا دینے کو شکست و پامالی کا باعث ٹھہرایا گیا ہے

یورپ میں طویل کشمکش اور معاشرتی الجھاؤ کے نتیجے میں بالآخر ریاست کو مذہب پر تقویت حاصل ہو گئی۔ بیسیوں نظریات کے جنہوں نے جدیدیت کے سائیوں تلے معاشرے کو فرد کی تقسیمی سطح پر لا کھڑا کیا اور اس عہد کے

آنے تک فرد مذہبی شکنجوں سے نہ صرف آزاد ہوا بلکہ ان تمام حدود کو بھی پار کر گیا کہ جو مذہبی افکار کی تعین کردہ تھیں۔ مذہب میں ایک عنصر مابعد الطبیعاتی ہوتا ہے کہ جس میں جزاو سزا کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ معاشرتی اقدار کہ جن کو مذہبی قوت سے مضبوطی ملتی ہے وہ صرف اسی مابعد الطبیعاتی عنصر کا نتیجہ ہی ہے، مگر جب یورپ میں مذہب کمزور ہوا تو وہ تمام اخلاقیاتی چیزیں کہ جن کو مذہب کی قوت کی پشت پناہی حاصل تھی وہ بھی رخصت ہوتی چلی گئیں۔

اب معاشرے کو اس وقت ایسی ضرورت تھی کہ کسی طرح ان اقدار کو از سر نو زندہ کی جائے اور اخلاقیات کو دوبارہ سے بحال کیا جائے تو اس لیے فرد فرد آزاد معاشرہ کو وکٹررین تصور اخلاق کی طرف لایا گیا کہ لازمی انسان مکمل طور پر خدا کو ان حدود و قیود کے جو کسی بھی معاشرہ کا حسن ٹھہرتی ہیں لاگو کیا جائے۔ اس معاشرے کے کمزور و ناتواں افراد کے حقوق کی اہمیت پر زور دیا گیا، یہ ایک متبادل کے طرز پر تھا کہ جس کی وجہ سے معاشرہ کے حسن کو بحال کر کے فائدہ حاصل کیا جائے۔

وکٹورین تصور اخلاق میں وہ طبقاتی کشمکش کہ جس کا یورپ کو سامنا تھا، سامراج سرمایہ دار اور طاقتور قوتیں اپنے شکنجے مظلوم، محکوم و کمزور انسانوں پر گاڑھے جا رہی تھیں ان کے خلاف ایک طرح سے آواز بلند کی گئی ہے۔ بچوں، ضعیفوں، قیدیوں، بوڑھوں اور خواتین کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ اسکا بنیادی مقصد طبقاتی کشمکش کا خاتمہ کرنا تھا کہ جسکا سامنا اہل یورپ کو تھا، وکٹورین تصور اخلاق کے پس پردہ جو سیاسی مقاصد کار فرما تھے تو وہ یہ کہ مذہب کی کوئی متبادل صورت عوام کے سامنے رکھی جائے کہ جس سے کلیساء کا تسلط بھی دوبارہ سے قائم ہو اور اخلاقی پہلو بھی کسی اور صورت میں عوام کو اپنے دائرہ میں محدود رکھیں۔ اس لیے مساوات، برابری و رواداری سے ایک ایسی قوم کی تشکیل کرنا م مقصد تھا کہ جس میں پورے معاشرہ کے تمام افراد ایک سے ہوں اور ایک فرد کا دکھ پورا معاشرہ محسوس کرے۔ یہ کسی بھی معاشرہ کے تمام افراد کو ایک نئے تصور قومیت میں دیکھنے کی کوشش تھی کہ جو طبقاتی کشمکش کے خلاف تھی۔

اگر ہم آخری عہد مغلیہ کا جائزہ لیں تو جو وجوہات مسلم قوم کی شکست کی سامنے آتی ہیں ان میں بنیادی وجہ طبقاتی کشمکش ہی ہے، طبقاتی گروہ بندی کی اسلام ممانعت کرتا ہے اور تمام مسلمانوں کو برابری ورواداری کا درس دیتا ہے ۔قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور فرقوں میں مت بٹو (القرآن)

مگر ہندوستان میں مسلمان خاندانوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور غریبوں کے حقوق کی پامالی کرتے نظر آتے ہیں، یتیموں، بیواؤں، کمزوروں، ضعیفوں کا کوئی پرسان حال نظر نہیں آتا تھا، ہر طرف سے کمزور کا استحصال کیا جارہا تھا، ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ ابتدائی ایثار، قربانی والا جذبہ نہیں رہا۔اس لیے نچلے طبقہ کا خیال نوابوں، رؤساء اور امراء مسلمانوں کو نہیں تھا۔جو ان مسلمانوں کے ساتھ سلوک روا رکھا جارہا تھا ان غریبوں کی حالت کو تبدیل کرنے کے لیے امیر طبقہ کچھ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

مجموعہ نظم بے نظیر میں ہندوستان میں طبقاتی کشمکش کے حوالے سے بہت خوبصورت انداز میں معاشرہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ان تمام عناصر جن کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوستان میں طبقاتی کشمکش نے جنم لیا اور فروغ پاتی رہیں ان عناصر وعوامل کی نشاندہی کی گئی بلکہ اس کو شکست اور حکومت کے ختم ہونے اور مسلمانوں کے محکوم ہونے کی بنیادی وجوہات میں شامل کیا گیا ہے۔نظم بے نظیر میں ان عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے اور پرزور مذمت بھی کی گئی ہے۔از سرنوع تشکیل معاشرہ کے واسطے ان بیمار رویوں کو ختم کرنے پر زور دیا گیا ہے اور ایک مثالی معاشرہ کہ جس میں تمام انسان برابر ہوں پر زور دیا گیا ہے اور ایسی مساوات کو ہی کامیابی کا ذریعہ ٹھہرایا گیا۔

تحقیقی نتائج

موضوع ڈپٹی نذیر احمد کا شعری مجموعہ نظم بے نظیر کا تنقیدی جائزہ (نو آبادیاتی عہد کے وکٹوریائی تصور اخلاق کے تناظر) کے حوالے سے تحقیقاتی کام کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

- مجوزہ تحقیق کے ذریعے ہند مسلم معاشرے کی ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی تغیر کی تصویر واضح ہوئی۔
- نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کے محرکات کی وضاحت منظر عام پر آئی اور وکٹوریائی تصور اخلاق کے پہلوؤں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ گم گشتہ روایات واضح ہوئیں۔
- ڈپٹی نذیر احمد نے شعری مجموعے نظم بے نظیر میں نوآبادیاتی فکر کی عکاسی کی، اپنی نظموں کے ذریعے مذہبی جمود کے خلاف آواز اٹھائی۔
- ڈپٹی نذیر احمد نے مذہبی نکتہ نظر کا تحلیلی مطالعہ کیا اور نئے تصورات یعنی کہ وکٹوریائی تصور اخلاق کے تناظر میں واضح فکر قائم کی۔
- ڈپٹی نذیر احمد نے نظم بے نظیر میں تجربیت کے عمل کو مد نظر رکھ کر تاریخی شعور کے اعتبار سے معاشرتی مسائل کی وجوہات تلاش کیں اور حل وکٹوریائی تصور اخلاق کے تناظر میں بیان کیا۔

کتابیات

☆ احمد، افتخار۔ مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء۔

☆ احمد، جمیل۔ اسلامی تہذیب کے گہوارے، کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۴ء۔

☆ احمد، نذیر۔ نظم بے نظیر، مرتب: احمد، بشیر الدین، دہلی: مفید عام اسٹیم پریس، ۱۹۱۸ء۔

☆ اصلاحی، ابوسفیان۔ سرسید کا تصور ثقافت، کراچی: سرسید یونیورسٹی، ۲۰۰۱ء۔

☆ بیگ، فرحت اللہ۔ مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس تاجران کتب، ۱۹۵۲ء۔

☆ تارا، چند۔ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، دہلی: آزاد کتاب گھر، ۱۹۶۶ء۔

☆ تارا، چند۔ اہل ہند کی مختصر تہذیب، دہلی: آزاد کتاب گھر، ۱۹۶۶ء۔

☆ حسن، ابن سامراج۔ سرمایہ داری کی انتہائی منزل، لاہور: مشعل، ۲۰۱۵ء۔

☆ حسن، جعفر۔ ہندوستانی سماجیات، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء۔

☆ حسن، محمد۔ اردو ادب کی سماجی تاریخ، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۸۱ء۔

☆ حسین، عابد۔ قومی تہذیب کا مسئلہ، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء۔

☆ سالک، عبدالمجید۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں، اسلام آباد: ادارہ ثقافت پاکستان، ۱۹۸۷ء۔

☆ سہیل، محمد عامر۔ نوآبادیات ومابعد نوآبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق)، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء۔

☆ شجاعت، فاطمہ۔ سماجیات کے اصول، دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۸۹ء۔

☆ عالم، افتخار۔ حیات النذیر، دہلی: شمسی پریس، ۱۹۱۲ء۔

☆ قریشی، ابوسعید۔ عناصر تہذیب، لاہور: مکتبہ لاہور، ۱۹۶۰ء۔

☆ کامل، قریشی۔ اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء۔

☆ کے کے، کوسیمی۔ قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخ پس منظر میں، دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء۔

☆ گلزار، ثاقب۔ ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام (تاریخ اور ادب کے تناظر میں)، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۶ء۔

CE...